رقصِ لمحات
شعری تخلیقات
ڈاکٹر تنویر احمد علوی

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

نام کتاب : رقصِ لمحات
مصنف : ڈاکٹر تنویر احمد علوی
اشاعت اول : 1998ء
تعداد : 500
کتابت : محمد ہارون
مطبع : ایم۔ آر۔ پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
قیمت : 165 روپے
ناشر : ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ 3746۔ چوڑیوالان۔ دہلی۔ 6

تقسیم کار

1۔ شاہد پبلی کیشنز: 2253۔ گلی ریشم والی، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی 2۔ فون نمبر 3258309
2۔ ایپٹ کمپیوٹرس، 2652/55 پہلی منزل، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی 2۔ فون نمبر 3250198
3۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی۔ 2

RAQ'S-E-LAMHAT

Dr. Tanveer Ahmad Alvi

Processed & Printed by Apt Computers
2652/55, 1st Floor Kucha Chelan,
Darya Ganj, New Delhi-110002
Ph. : 3250198

انتساب

محب صادق الولا

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس

کے

نام

ترتیب

نشان صفہ		صفحہ نمبر
	میرا دوست میرا شاعر	۱۳
	اب چراغوں کو صلیبوں سے اترا جائے	۲۴
۱	شمعیں اشکوں کی، جلانے کے لیے زندہ ہوں	۳۰
۲	نسیم ناز کھلاتی رہی، حجاب میں پھول	۳۱
۳	ہر طرف ہے، کوچۂ قاتل میں، دل گیروں کا رقص	۳۲
۴	کیا ضروری ہے، کوئی "بے سبب آواز" بھی ہو	۳۳
۵	سربلندی، تو صلیبوں کا، مقدر ہے جہاں	۳۴
۶	وہ شاعرِ مشرق ہو، یا شاعر المانی	۳۵
۷	شوخیاں برقِ ادا کی وہ بھی دل گیروں کے ساتھ	۳۶
۸	مشترک درد کے رشتوں میں، وفا ہے بھی کہاں	۳۷
۹	ہم صلیبوں کو لیے حدِ ادب تک پہنچے	۳۸
۱۰	کس سے ہے درد کا رشتہ، تری محفل کے سوا	۳۹
۱۱	عجیب شخص ہے، پتھر سے پر بناتا ہے	۴۰
۱۲	حرفِ دل مختصر ہو، تو کیا کیجئے	۴۱

نشان صفحہ		صفحہ نمبر

نشان صفحہ		صفحہ نمبر
۵۴	سُنا کیے، جسے افسانہ و خبر کی طرح	۸۳
۵۵	دل ہے اور رقصِ سَلاسل، تو اسے کیا کیجیے	۸۴
۵۶	ریشمی رات کی، خوشبو کے سہارے، چلیے	۸۵
۵۷	یہ کس سے کہیے کہ خوابوں کے ساتھ گذری ہے	۸۶
۵۸	بن کے سایہ ہی اب جیا جائے	۸۷
۵۹	کششِ سنگِ در کو کیا کیجیے	۸۸
۶۰	"انا کی" کی قید سے باہر نکال دے مجھ کو	۸۹
۶۱	ہم نفس، ہم صدا، ملا نہ ملا	۹۰
۶۲	مل بھی جاتے جو کہیں آبِ بقا کیا کرتے	۹۱
۶۳	جو سانس لے، وہ رہے دردمند، کیا کیجیے	۹۲
۶۴	ہر سفر، ایک مرحلہ بھی تو ہے	۹۳
۶۵	یہ بات دشتِ وفا کی نہیں، چمن کی ہے	۹۴
۶۶	شیشہ و شبنم و شہاب کی بات	۹۵
۶۷	وہ ناز، حُسنِ مجسّم جسے کہا جائے	۹۶
۶۸	دھوپ ہی دھوپ ہے پلکوں کی پناہوں کے سوا	۹۷
۶۹	نظر فریب نظاروں کا، اعتبار آئے	۹۸
۷۰	خواب تو خواب ہے، تعبیر بدل جاتی ہے	۹۹
۷۱	یہ شیشہ کاری وہم و گماں، عجیب سی ہے	۱۰۰
۷۲	گرہ زُلف دوتا کے، کوئی معنی نہ رہے	۱۰۱
۷۳	شیشہ در شیشہ ہے مے خانہ بہ مے خانہ ہے	۱۰۲

نشان صفحہ		صفحہ نمبر

نشان صفحہ		صفحہ نمبر
۹۴	پیشہ ور ہیں جو قاتل ہیں کیا کیجیے	۱۲۳
۹۵	روایتِ لبِ اظہار توڑ دی ہیں نے	۱۲۴
۹۶	چراغِ دل کہ شہابوں کا جو نشانہ بنے	۱۲۵
۹۷	دل بے داغ بے نشاں بھی تو ہے	۱۲۶
۹۸	منزل ملے، ملے نہ ملے راستہ ملے	۱۲۷
۹۹	آگ تو آگ سے نہ بجھ پائی	۱۲۸
۱۰۰	دشتِ جاں کے ساتھ ہے صحرا کی تنہائی کا بوجھ	۱۲۹
۱۰۱	کون سمجھے گا، بھلا اُس نگہِ ناز کی بات	۱۳۰
۱۰۲	یہ وقت کہ آگ کا دریا ہے اور ساحل ساحل طوفاں ہے	۱۳۱
۱۰۳	اب نہ وہ سر ہے نہ آشفتہ سری	۱۳۲
۱۰۴	فشارِ حسن سے آغوش تنگ دہکے ہے	۱۳۳
۱۰۵	سنگ سے شیشہ و ساغر کو تراشا ہیں نے	۱۳۴
۱۰۶	اپنی ادا پہ ہم ہی ہوئے خوار بھی بہت	۱۳۵
۱۰۷	دل کے پھولوں کے قافلے ہیں یہ حرف	۱۳۶
۱۰۸	دل کے بھولے ہوئے افسانے بہت یاد آئے	۱۳۷
۱۰۹	جو محفل محفل رقصاں ہیں وہ پھول نہیں پیمانے ہیں	۱۳۸
۱۱۰	خود کو مانوسِ جفا کرتے رہے	۱۳۹
۱۱۱	لمحہ در لمحہ گزرنا ہی چلا جاتا ہے	۱۴۰
۱۱۲	کمندِ حلقۂ گفتار، توڑ دی ہیں نے	۱۴۱

نظمیں

میرا دوست میرا شاعر

ڈاکٹر تنویر احمد علوی میرے دیرینہ دوست اور رفیق ہمدم ہیں وہ زندگی کی راہ میں میرے ہم قدم کبھی نہیں رہے کہ ان کا پیشہ شروع ہی سے پڑھنا پڑھانا تھا اور میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ سرکاری ملازمت اور انتظامی امور سے عملی طور پر دل چسپی میں گزارا۔ لیکن ان کے ساتھ خلوص و یگانگت کا جو رشتہ اب سے تقریباً نصف صدی بیشتر قائم ہوا تھا نہ وہ کبھی ٹوٹا نہ اس میں کوئی گرہ پڑی۔

میں ریاست پٹیالہ کا رہنے والا ہوں اور وہ کیرانہ ضلع مظفر نگر مغربی یو پی سے تعلق رکھتے ہیں جو اس علاقہ کا ایک مشہور قصبہ اور مردم خیز خطہ رہا ہے اس قصبہ کی تاریخ تو بہت قدیم ہے لیکن عہدِ اکبری و جہانگیری کے پر شکوہ ایام میں اسے جو اوج و عروج نصیب ہوا وہ اس کی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ اس زمانے کے تاریخی آثار کو اس کے نقوش تعمیر میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے میں وقتاً فوقتاً وہاں آتا جاتا رہا ہوں اور میں نے یہاں کی تاریخی یادگاروں سے اپنے ڈاکٹر صاحب کی خصوصی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے تصویریں بھی کھینچیں "کھاس" نامی جھیل، نوابی تالاب اور آس پاس کے علاقہ میں پرندوں کا شکار بھی کھیلا۔ اب اس پر بھی یہ کہیئے کہ ایک وقت بیت گیا۔ یاد ایام عشرتِ فانی۔

ڈاکٹر صاحب سے ابتدائی تعارف پٹیالہ کے ایک مشاعرہ میں ہوا وہ مشاعروں

کے شاعر، نہ آج ہیں نہ پہلے کبھی رہے لیکن پٹیالہ میں ایک نمایش کے دوران انھوں نے
اپنی نظم رقاصہ سنائی تو گویا دھوم مچ گئی مجھے تو یقین نہ آیا کہ وہ اس نوعمر شاعر کی
تخلیق ہے جو پٹیالہ طبیہ کالج کا ایک طالب علم ہے اور دیو بند کے مدرسہ میں فارسی
عربی پڑھ کر آیا ہے۔

اسی زمانے کے میرے ایک ہمدم دیرینہ، بیربل ناتھ بھی ہیں جو ابھی کچھ سال
پہلے، بی ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کے ممتاز عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔
انھوں نے اس وقت کے تنویر احمد علوی سے دوستی کا رشتہ قایم کیا اور مجھے یہ
بتلایا کہ واقعی وہ نظم اسی طالب علم کی (تخلیق) ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس
نوعمر یوپی والے میں شعر گوئی کا ملکہ اور اچھی اچھی باتیں کرنے کی صلاحیت موجود
ہے اور اس اعتبار سے اس کی سادہ سی شخصیت کافی پرکشش ہے۔

فن طب میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے باوصف بعد کی زندگی میں اُن کا علمی
ذوق وشوق انھیں ہندی انگریزی اور دوسرے مضامین کے مطالعہ کی طرف لے گیا
اور انھوں نے ہائی اسکول سے لے کر ایم اے تک امتحان کی منزل مرحلہ بہ مرحلہ طے کی
اور اسی سفر در سفر کے دوران الجمعیۃ دہلی کے کالموں میں بعض اہم موضوعات پر
مضامین لکھنے شاعری سے بھی کچھ زیادہ ان کے ادبی شعور کو نثری نگارشات میں
نمایاں ہونے کا موقع ملا۔

چھ سات سال تک مضمون نویسی وادب نگاری کا یہ سلسلہ جاری رہا اس
کے بعد وہ علی گڑھ پہنچ گئے اور ذوق پر اپنا تحقیقی اور تنقیدی کام دو سال کی
مدت گزرنے سے پہلے ختم کرلیا۔ ڈگری ایوارڈ ہونے کے بعد وہ دہلی کالج دہلی یونیورسٹی
آگئے اور آئندہ آنے والا اپنا تمام تر وقت تحقیق تنقید ترجمے اور تخلیق میں صرف
کرنا شروع کیا۔ ان کی شاعری بھی آگے بڑھی فکر و نظر کے دائروں اور فنی طریق
رسائی میں بھی نئی جہتیں اور نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن ان کی جو تالیفات شائع
ہوئیں وہ تحقیق و تراجم سے متعلق تھیں۔

اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انھوں نے ڈی لٹ بھی کیا جو اس یونیورسٹی کی تاریخ کی پہلی ڈاکٹر اف لٹریچر کی ڈگری تھی اور بایں معنی اس بڑی دانش کی تاریخ میں ڈاکٹر صاحب کے نام اور علمی کام کے ساتھ ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے خاص موضوعات تصوف، تاریخ صنمیات، اور مشرقی شعروادب کے تہذیبی ادارے اور سرچشمے ہیں۔

تاریخ کے حوالے ان کی زبان پر رہتے ہیں اور اپنی تحقیق و تنقید اور تخلیقی حسیات کی تصویر کشی و پیکر تراشی میں انھوں نے تاریخ و صنمیات کے مطالعہ ہی سے زیادہ تاثر قبول کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایک محقق، تاریخ سے دل چسپی لینے والے اسکالر نیز تحقیقی تنقید کے ایک نمائندے کی حیثیت سے جو لوگ انھیں جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ ان کی شاعرانہ شناخت سے نہ صرف یہ کہ واقف نہیں بلکہ اپنی ذہنی زندگی میں ڈاکٹر صاحب کو بحیثیت شاعر داخل کرنے کے لیے تیار بھی نہیں۔ ان کی نظموں کے خوب صورت مجموعے جس کا عنوان بھی پرکشش ہے اور خوشبو کی طرح خیال انگیز "لمحوں کی خوشبو" کے سامنے آنے کے بعد بھی انھوں نے ایک محقق کی شاعری میں اپنے لیے کوئی کشش محسوس نہیں کی اس پر بھی کچھ لوگوں نے جب اس کو پڑھا تو جیسے وہ چونک گئے جب کہ اس میں چونکنے کی کوئی بات نہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے ملنے والے ان کی باتوں سے واقف اور ان کے تحقیقی کاموں سے آگاہ اشخاص یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ان کی باتیں شاعرانہ ہوتی ہیں۔ مثلاً شعر شاعرانہ ترکیبیں اور تخلیقی نوعیت کے جملے ان کی زبان اور زبانِ قلم پر اکثر آتے رہتے ہیں۔

ان کی تحقیق و تدوین کے اکثر موضوعات شعروسخن ہی سے متعلق رہے۔ ادب اور تاریخ ان کی نظر میں ایک دوسرے کے ساتھ تضاد کا کوئی رشتہ نہیں رکھتے۔ بلکہ ادب، تاریخ کا ایک بڑا موضوع ہے کہ تاریخی حقائق کی بہت سی جزوی باتوں کا پتہ ادبیات ہی کے ذریعے چلایا جا سکتا ہے۔ "تاریخ اپنے محرکات اور موثرات

کے ساتھ جب آگے بڑھتی ہے تو اس کا جیتا جاگتا عکس ادبیات ہی میں نظر آتا ہے وہ معتقدات کی شکل میں ہوں یا معاملات کی ان کے پس منظر میں فلسفہ و سیاست ہو یا فکر و خیال۔ خواب ہو یا شکست خواب ـــ غرض یہ ہے کہ علوم ہوں یا فنون، اپنی خارجی منطق اور داخلی کیفیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ رہ کر اپنے وجود کی تکمیل کر ہی نہیں سکتے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی صحیح تعبیر ممکن ہوتی ہے نہ تفسیر۔

میں ڈاکٹر صاحب کی مجموعہ "لمحوں کی خوشبو" کا ذکر کر رہا تھا۔ جس کی بیشتر نظموں کو میں، یا ان کے خطوط میں پڑھ چکا تھا یا پھر ان کی زبان سے سن چکا تھا۔ اُن کے بارے میں میرے جو تاثرات تھے وہ بھی تقریر اور ابھی تحریر میں خیال سے حال تک آتے رہتے تھے۔ اس مجموعے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا ایک نوشت نامہ بھی ہے۔ اس میں میرے لیے چونکا دینے والی تو کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی یہ دوسروں کی طرح میرے لیے بھی خصوصی توجہ کا تقاضا کرنے والی ایک آواز دوست ضرور تھی۔ اس مجموعے میں "عناصر اربعہ" کے طور پر چار غزلیں بھی شامل ہیں۔ کچھ فارسی کلام بھی ہے اور باقی تمام نظمیں ہیں۔

جیسا کہ مجھے پہلے بھی معلوم تھا ڈاکٹر صاحب نے اپنی اوائل عمر میں پہلے غزلیں ہی کہی تھیں لیکن بہت جلد وہ غزلوں سے نظموں کی طرف آگئے۔ اس کی وجہ ان کا مطالعہ، تجسس، تجربہ، اور اپنے انداز سے اس دور کے خارجی حقائق کا تجزیہ تھا۔ چونکہ ناول پڑھنے کا ان کو بہت شوق تھا اس لیے وہ تسلسلِ فکر کے عادی ہو گئے تھے۔ یوں بھی وہ دور نظموں ہی کا دور تھا۔ اقبالؔ، حفیظؔ، جوشؔ، ساغر نظامی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر جیسے شعراء جو اس وقت کے نوخیز ذہنوں کو متاثر کر رہے تھے وہ سبھی نظم نگار تھے۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت ادبیات کے نہیں فنِ طب کے طالب علم تھے۔ اپنے ہم جماعتوں میں بہت ممتاز اور اپنے اساتذہ میں ہر دلعزیز، لیکن میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی ان کے ہاتھ میں کوئی ادبی رسالہ دیکھا اور

ان کی توجہ کسی خاص تصویر پر مبذول پائی۔ اس زمانے کے رسائل میں اس طرح کی فنکارانہ تصویریں چھپتی تھیں جو تاریخ و تہذیب کے کچھ خاص مرحلوں سے واسطہ رکھنے والی شخصیتوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ بلکہ زینوبیہ قلوپطرہ اور سالومی ایسی ہی نظموں میں سے ہیں جو تصویروں کو دیکھ کر لکھی گئیں۔ سالومی ان میں خاص کردار ہے جس پر اپنے تعارف نامے میں ڈاکٹر صاحب نے کئی صفحہ صرف کیے ہیں۔ ایسی اور بھی کچھ تصویریں تھیں۔ جن پر نظمیں لکھی گئیں یا مختلف نظموں پر ان سے متعلق تاثرات کی پرچھائیاں پڑتی پڑی نظر آئیں۔

تاریخی یادگاریں بھی اسی زمانے سے ان کو بہت متاثر کرتی تھیں۔ وہ ان یادگاروں میں چھپی ہوئی تاریخی حسیت کو اپنے طور سے شعوری یا نیم شعوری سطح پر شعری گرفت میں لانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ قطب مینار، دیوارِ چین اہرام اور قلعۂ معلیٰ جیسی ان کی نظمیں تاریخی یادگاروں ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایلورا، اجنتا، "کھاجوراہو" جیسے لافانی عنوانات پر جو نظمیں لکھی ہیں اس میں ہندو اور بودھ فلاسفی کے مطالعہ کا بھی عکس موجود ہے اور اس حسیت اور شعور کا بھی جس کے ساتھ آج کا فنکار ان لافانی نقوش و آثار کو دیکھتا ہے۔۔۔ کھاجوراہو اور اب "کونارک" میں انھوں نے اس تخلیقی شعور کو بھی فلسفیانہ حسیت کے ساتھ شاعری کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جو ان عظیم یادگاروں کے ذہنی پس منظر کے طور پر ان کے معماروں اور فن کاروں کے سامنے رہا تھا۔

ان نظموں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اوائل عمر ہی سے ہندو صنمیات میں اتنی گہری دل چسپی کیوں رہی ہے۔ صنمیات سے میری مراد بت پرستی ہرگز نہیں بلکہ حسن پرستی اور پیکر شناسی ہے جس کے بغیر حسن کے روحانی تصورات تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور بدن کے معنوی پہلو تک رسائی مشکل ہے وہ پتھر کے بتوں کو بھی سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ تخلیقی حسیت کے بر ملے صرف جذبات

پرستش کے آئنہ دار نہیں ہیں بلکہ ان کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔

بدن کا ذکر نظر کے فاصلے چاہتا ہے، نقش ہو یا رنگ، دائرے ہوں یا زاویے ان کو وہ لمسِ لطیف اور جبیل حسیات ہی کے وسیلہ سے چھونے کے قابل ہیں مگر یہ عمل، لفظ کے بے جان پیکر میں جان ڈال دے یہ بالکل ممکن ہے۔

ان نظموں کو ہم دور بدور ان کے عمر اور شعور کے ساتھ فکر و نظر کے نئے سانچوں میں ڈھلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان کی دو خاص نظمیں ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ ان کے دوست اور ایسے عزیز جوان کی شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے ان کے مصرعوں اور شعروں کو دہراتے تھے۔ یہ نظمیں اپنے عنوانات کے اعتبار سے "باندی" اور "کسبی" کے روپ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ "باندی" تاریخ و تہذیب ہے اور "کسبی" معاش و معاشرت، نیز ان کے مابین گزرتی ہوئی وہ برقی لہر جس کو نسوانی زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عورت "چراغ خانہ" بھی رہی ہے اور "شمع محفل" بھی۔ وہ رگِ جاں سے بھی قریب رہی ہے اور تارِ بستر سے بھی۔ اس کی کہانی انسان، اس کی بشریت اور فطرت کی بھول بھلیوں کی کہانی ہے۔

اس وقت جب کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مجموعے کو ترتیب دیا تھا وہ غزل کی طرف بہت کم توجہ دے رہے تھے اور نظم نگاری کے عشق میں انھوں نے اپنی زندگی کا بہت سا وقت صرف کیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ان کے ساتھ، ان کے عزیز دوست ڈاکٹر شریف احمد صاحب سے ملنے گیا تو شریف صاحب نے "لمحوں کی خوشبو" پر گفتگو کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ چار یا پانچ ہی غزلیں کیوں۔ پچاس کیوں نہیں؟ اب یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے بعد کے پانچ سال غزل نگاری میں گزرے اور جو نظمیں لکھی گئیں ان میں "کونارک" ہی ایک ایسی نظم ہے جس کو وہ بار بار لکھتے اور اس پر نظر ثانی کرتے رہے۔ باقی نظمیں یہ کہیے کہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں اور اُن کی حسیات جمال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ دور دراصل ان کی نت نئی غزلوں کا دور ہے۔

وہ اکثر اپنا کوئی ایسا شعر گنگناتے رہتے ہیں جو ان کی کسی تازہ غزل کا حصّہ ہوتا ہے۔

جب ان سے ملاقات کا اتفاق ہوتا ہے تو ذہن من و تو اور غم جہاں کے ذکر مسلسل کے علاوہ کچھ وقت ان غزلوں پر بھی صرف ہوتا ہے اور یہی ان سے ملاقات کا، یہ کہیئے کہ بہترین وقت ہے کہ اس وقت ہم ایک اسکالر سے نہیں ایک صاحب مطالعہ شخص سے نہیں، زندگی کی ذمے داریوں میں گھرے بلکہ الجھے ہوئے ذہن سے نہیں ایک انسان سے ملتے ہیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سن سکتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک ایسے شخص نے جو مسلسل ریسرچ کرتا رہا اپنے مطالعہ کی حدود کو آگے بڑھاتا گیا جس نے فارسی، اردو، ہندی ادبیات کے علاوہ قوموں کی تاریخ کے اوراق کو پڑھنے میں بھی اپنا بہت سا وقت صرف کیا جس نے سنسکرت اور کئی دوسری زبانوں کے ادب اور فلسفۂ ادب کو تراجم اور لفظی تجزیوں اور تاریخوں کی مدد سے پڑھا۔ نظموں سے جس کی دل چسپی کا تار کبھی نہیں ٹوٹا وہ غزلیہ شاعری کی طرف کیسے آگیا۔؟

ڈاکٹر صاحب سے پوچھا مگر وہ تو خود ہی اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے اس سوال کے ریشم میں اپنے ذہن کو الجھا ہوا محسوس کرتے ہیں ممکن ہے اس کی وجہ ان کا طویل ادبی تجزیہ ہو جس کے پس منظر میں پوری زندگی کا ایک گہرا تجسّس موجود ہے کیا ہے اور کیوں ہے کی تلاش ہے۔ وہ آخر تجربے سے تجزیے تک آگئے ہیں اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں نظم کے مقابلے میں غزل کی شاعری زیادہ اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔

غزل میں آدمی دوسروں سے نہیں بلکہ اپنے سے باتیں کرتا ہے اور ذہنی لہروں کو دل کی دھڑکنوں سے زیادہ قریب آتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

وہ تو بہت پہلی بات ہے کہ "غزل محبوب سے باتیں کرنا ہے"، محبوب تو آدمی کا آئیڈیل ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بت تراشی اس لیے

بھی بت تراشی ہوتا ہے کہ وہ بت شکن ہوتا ہے۔ زندگی کی اس خواب و شکست خواب کے خاموش عمل میں حقائق زیادہ "پینا پن" اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پتھر کے ٹکڑے بھی شیشے کی کرن کی طرح اپنی نئی دریافت اور ماضی کی نئی تعبیر اور بازیافت کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بھی اگر ایسا ہی ہوا ہو تو کوئی تعجب نہیں۔

سوال یہ ہے کہ شاعری کیوں کی جاتی ہے۔ "شخصیت"، ذہنی بیداری اور فکری بالیدگی کی مختلف اور متنوع کیفیات کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اور یہ "ہم آہنگی" توازن اور ترتیب کے پیچیدہ عمل سے تشکیل پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں گونج زیادہ اور کشش مقابلتاً کم ہوتی ہے۔ اور کسی کے یہاں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ گونج شخصیت کی "انسانیت" اور کشش "انفرادیت" کی طرف ذہن کو مائل کرتی ہے۔ ہر شاعر کی اپنی ایک نظریاتی سرزمین ہوتی ہے اور اس میں جذباتی پھیلاؤ اور تخیل و تمثیل کے گوناگوں مرقع ہوتے ہیں جو برابر بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ جو اس کی انفرادی حیثیت تک پہنچنے کے لیے اسی طرح ضروری ہوتے ہیں۔ جس طرح اس کے دل کی دھڑکنوں کی تکرار میں اس کی "انانیت" کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اگر کوئی شاعر اپنی بات کہتا ہوا ملے تو پھر اس کے ساتھ اپنا لب و لہجہ اس کا منفرد انداز بھی ضروری ہوگا جو دوسرے شعراء سے اس کو الگ کر کے اس کی اپنی انفرادیت کی شناخت قائم کرتا ہے پہلے کی طرف اور ہماری سماعت کو اس کے نغمے کی طرف اور ہماری قوتِ ادراک کو کشاں کشاں اس کے اسلوب ادا کی طرف لاتا ہے۔ جب ہم اس اعتبار سے غور کرتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ منفرد لب و لہجہ کی پہچان نظم میں بھی ممکن ہے لیکن نظم ایک اجتماعی اندازِ نگارش اور طرزِ گزارش کی بھی مختلف صورتوں میں نمائندگی کرتی ہے جب کہ غزل اپنی عمومیت کے باوصف کسی مخصوص لہجے کے بغیر غزل بنتی ہی نہیں۔ اس کا امتیاز غیر شخصی اندازِ اظہار کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ یہیں پہنچ کر کوئی بھی شاعر خود کو نظم سے غزل کی طرف لانے پر غیر شعوری طور ہی سے سہی اپنے آپ

کو مجبور پاتا ہے۔

یوں بھی زیادہ وقت تک ایک ہی دائرۂ فکر اور اندازِ نظر میں قید رہنے کے ساتھ دہرانے کے عمل کا خطرہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے آدمی کے تجربے کو "زادۂ فکر" قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی حال یا خیال کوئی بھی احساس یا ادراک، تجربہ یا تجزیہ اگر نقطۂ ہجرت" سے نہ گزرے تو خود کو دہرانے سے نہیں بچ سکتا۔ ہمارے بڑے شاعروں اور فنکاروں نے اپنے آپ کو اس لیے بھی نئی راہوں کے سفر پر مجبور کیا کہ اب وہ زیادہ دنوں "تک طے شدہ مرحلوں کی غلام گردشوں کا سفر نہیں کر سکتے تھے" راستے ختم ہو جاتے ہیں اور سفر باقی رہتا ہے" تو پھر نئے راستوں کی تلاش ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطالعہ کے ذریعے بھی زندگی کے ہر موڑ پر کچھ نئے چراغ جلانے کی کوشش کی، اس کا اندازہ ان کے دائرۂ تصنیف و تالیف کے موضوعات پر ایک نظر ڈالنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی داخلی شخصیت کی شناخت شاید اس وقت زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے جب ہم ان کی نظموں سے گزر کر ان کی غزلوں کی طرف آتے ہیں۔ فن کو زندہ رکھنے کا یہ عمل تہذیب و تاریخ میں ہمیشہ جاری رہا ہے۔

ان کی غزلیں بیک وقت ان کے مشاہدے اور عملی تجربے کی خوب صورت انداز سے نشاندہی بھی کرتی ہیں اور ان کے مطالعے کے نقوش و آثار بھی ان کے پس منظر اور ان کی علامتوں میں جھلکتے ہیں۔ اس موقع پر بے اختیار ان کا یہ شعر یاد آگیا ؎

اس پہ منقوش ہیں صدیوں کی الف لیلائیں

اور یہ دل آج بھی بے نام و نشاں ہے کہ جو تھا

صدیوں کی "الف لیلائیں" ان کا مطالعہ ہے۔ تحقیق اور تجسس ہے اور وہ دل جو آج بھی بے نام و نشاں ہے یہ زندگی کا وہ تجزیہ ہے جو انھیں غزل کی

طرف لایا۔

ان کی غزل نئی عصری حسیت کی بھی نمائندگی کرتی ہے اور تخلیقی شعریت کی بھی جوان کے ادبی شعور سے عبارت ہے۔ انھوں نے بہت ہی کم غزلیں ایسی ہیں جو دوسروں کی زمینوں میں لکھی ہوں اور جہاں ایسا ہوا بھی ہے غالباً ان کی شعوری یا نیم شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ وہ پیروی سے بچتے ہوئے آگے بڑھیں اور اس معنی میں ان کے قدموں کے نیچے ان کی اپنی زمین ہو۔ ان کی بیشتر غزلوں پر ان کے ذاتی تجربے اور ذہنی تجزیے کی پرچھائیں کہیں واضح اور کہیں نیم واضح صورت میں ملتی ہیں ان میں تلخ مسکراہٹیں بھی شامل ہیں اور شیریں آنسو بھی۔

تجسس سے تجربے اور تجربے سے تجزیے تک کا عمل ان کے یہاں دھوپ چھاؤں کے کھیل کی طرح برابر آگے بڑھتا رہا ہے۔ کچھ تصویریں ایسی بھی ہیں جو فانوس خیال کی گردش کے ساتھ اپنے جلووں کی تکرار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کے لیے ہم ان کی بعض تشبیہوں اور علامتوں پر غور کر سکتے ہیں۔ بعض ترکیبیں بھی اسی کے ذیل میں آتی ہیں جیسے چراغوں کا سفر، سرابوں کا سفر یا پھر صلیبوں کا سفر۔ صلیب ان کے یہاں ایک علامت بھی ہے اور تاریخی حسیت کا ایک نشان بھی۔ یہی صورت بُت کی بھی ہے۔ غالب کے لیے کہا جاتا ہے ان کی فکر نے ایران کے آتش کدوں میں پناہ لی ڈاکٹر صاحب کے یہاں ایران کے آتش خانوں کے بجائے ہندوستان کے بُت کدے آگئے جن کے سیر و سفر سے انھیں گہری دل چسپی رہی ہے۔

پتھر، پھول، چراغ، آئنہ اور شیشہ ان کے یہاں آنے والی دوسری علامتیں ہیں خوشبو، شبنم، ریشم اور آبگینہ اسی سمتِ سفر اور مشاہدۂ نظر کی نمائندگی یا عکاسی کرتی ہیں۔ یہ لفظ ان کے یہاں بار بار آئے ہیں لیکن دوہرانے کا عمل اس بازیافت میں شامل ہوا ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے کوئی نہ کوئی نئی بات ان اشاروں کے ساتھ کہی ہے اور ان علامتوں کے زبان یا زبان قلم پر آنے کے معنی کو ہم ان ڈھنگ کے سے رنگوں میں تلاش کر سکتے ہیں جو فکر کے اس نیم دائرے کو کسی نہ کسی تابناک

پہلو سے آشنا کرتے ہیں۔

دل کا مقسوم ہیں پتھر کی لکیریں، پھر بھی
اِن لکیروں کو، مٹانے کے لیے زندہ ہوں

کاغذِ آتش زدہ میں، یہ مچلتی بجلیاں
کس سے کہیئے، ہے دلِ ناداں کی تصویروں کا رقص

بے طلب، جو بھی ملا، اُس کے سوا، کیا ملتا
بے نیازی کے لیے، دستِ عطا ہے بھی کہاں

دور تک، وادیٔ افکار کا، یہ سناٹا
کوئی جھنکار نہیں، رقصِ سلاسِل کے سوا

دل و نظر کے فسوں اس کو راس آنہ سکے
وہ آئینوں سے، گذرنے کو، در بناتا ہے

اس پہ منقوش ہیں صدیوں کی الفِ لیلائیں
اور یہ دل آج بھی، بے نام و نشاں ہے کہ جو تھا

چاند بہاری لال بھٹناگر

اب چراغوں کو صلیبوں سے اتارا جائے

کبھی قدرت کسی انسان کو کئی فنون میں ماہر ہونے کا وردان دیدیتی ہے۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا کوئی گن ان کی شخصیت کی شناخت اس طرح بنتا ہے کہ باقی ہنر چھپ سے جاتے ہیں جیسے سورج اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ چمکتا ہے تو آکاش ساگر میں سوائے نیلاہٹوں کے کچھ نظر نہیں آتا اور جب وہ ذرا اوٹ میں ہوتا ہے، رخ بدل لیتا ہے تو کتنے ستارے، کہکشائیں، خواب و مہتاب، جاگتی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور یہ سب سورج ہی کی دین ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا محقق ہونا علمی، ادبی حلقوں کے سامنے کچھ اس طرح چھایا رہا ہے کہ دوسری باتوں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی۔ خاص کر شاعری کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا حالانکہ "میگھ دوت" کا شعری ترجمہ ہندی میں وہ بہت پہلے کر چکے تھے۔

علوی صاحب کے تحقیقی کاموں سے الگ ان کی شاعری پڑھنے کا موقع مجھے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی ملا اور اس طرح کہ انھوں نے کئی بہترین غزلیں میری موجودگی میں باتوں کے دوران ہی لکھیں۔ کئی بار کوئی نئی غزل شروع کی تو سنانے میرے گھر چلے آئے اس طرح ان کے اشعار کے مختلف مرحلوں سے گزرنے میں، میں ان کے ساتھ شریک رہی۔

عجیب سا لگتا ہے سوچنے میں کہ تحقیق جیسے خشک موضوع کا ماہر اتنے پیارے

اشعار کس طرح کہہ پاتا ہے۔ ایسے سچے اشعار جو زندگی سے جڑے ہوں اور اس زندگی کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا نہ ہو۔ تاریخ، تہذیب، علم اور تحقیق، حال کے دل میں اتر کر سانس لیتے ہوں۔ یہ شاید تب ہی ممکن ہو پاتا ہے جب احساس علم کو جذبے میں بدل دیتا ہے اور علم کو تخلیق کے ذریعے انسانی محسوسات میں بدل دینے کا کام ایک سچا فنکار ہی کر سکتا ہے۔

ان کی شاعری پڑھتے ہوئے جو علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ علوی صاحب کا ذہن کس طرح تاریخ کی گواہی دیتا رہا اور کیسے "احساس" میں ڈھلتا گیا۔ ان کے تصور کے ساتھ مل کے تخلیق کی شکل اختیار کر کے ایک تڑپ کا سفر نامہ بن گیا۔ جسے انھوں نے مختلف سمبلز میں ڈھال کر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ زندگی کو جوڑ دیا۔ ایسی ہی دو علامتیں ہیں بُت اور پتھر —— میں حیران ہوتی ہوں کہ بُت جو ظاہری طور پر سکون کی علامت ہے۔ پائیداری اور ٹھہراؤ کا اظہار کرتا ہے لیکن پتھر ہونے کی وجہ سے اس سے سرد مہری کے علاوہ کوئی اور توقع کرنا بھی مشکل ہے، علوی صاحب نے اس کا تصور ہی تبدیل کر دیا۔

گنگناتی ہوئی رتوں کی طرح
سانس لیتے ہوئے بتوں کی طرح

یہاں بُت آئیڈیل بن جاتا ہے، محبوب ہو جاتا ہے، صرف بے حس و حرکت متصور نہیں رہتا۔

شاید "بُت" کی علامت سے ہی علوی صاحب کا ذہن پتھر کی طرف مڑا اور انھوں نے تہذیبی حقیقتوں کے سچ کو پانے کے لیے ان کو اسٹڈی کیا۔

آج ہماری شاعری میں جو پتھروں کا ذکر آتا ہے اور ذہن و دل کے رشتے ان سے جا کر ملتے ہیں تو میں سوچتی ہوں یہ بے حسی کے ماحول میں بتوں کی طرح جینے کی خواہش ہے، خود بے حس ہو جانے کی نہیں۔

عجیب شخص ہے پتھر سے پر بناتا ہے
دیارِ سنگ میں شیشے کا گھر بناتا ہے
دل کا ٹوٹا ہوا سا پتھر ہے
آئینہ ہے جو انقلابوں کا

پتھروں کا ٹوٹ جانا کوئی عام بات نہیں ہوتی۔ اندر شدید دباؤ پاکر چٹانوں کی چھاتی پھٹ جاتی ہے۔ یہ ٹوٹتی چٹانیں سماج میں ٹوٹتے آدرش بنی ان انقلابوں کی کہانی کہتی ہیں جو خاموشی سے آتے ہیں اور جیون میں قیامتیں پیدا کرتے گزر جاتے ہیں۔ ٹوٹا ہوا دل، کسی عمارت کے ٹوٹے ہوئے پتھر کی مانند انقلابوں کی آئینہ داری کرتا رہتا ہے۔

ایک اور لفظ جو علوی صاحب کے یہاں بڑا نمایاں سمبل بن گیا وہ سفر ہے۔ سفر کے بغیر نہ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ نہ ذہن۔ پہاڑوں، پیڑوں، جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں سے جو ہتھ گانا تا ہے وہ انسان کے اپنے من اور ذہن کی یاترا گاہ ہے لیکن اس سفر کو طے کرنے میں ہم سفر کے معنی شاید ہر ایک کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ہمسفر روشنیاں ہوں یا سائے، نقشِ پا ہوں یا بگولے، زندگی کا سفرنامہ انہی کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے یہ ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلے کو پانا بھی ہے اور انھیں مرحلوں کے بیچ اپنانے، چھوڑنے اور نظر انداز کرنے کے کتنے مراحل طے ہو جاتے ہیں۔ اس شاعر نے ہمسفر صلیبوں کو بنایا ہے ؎

یہ کس سے کہیے کہ تنویرؔ خود صلیبوں کو
سکونِ جاں کے لیے ہمسفر بتاتا ہے۔
میرے وجود کا ہمزاد میرا سایہ ہے
میری صلیب بھی ہے میرے ہمسفر کی طرح
دل کے اس شہرِ مقدس کے اندھیرے توبہ!
اب چراغوں کو صلیبوں سے اتارا جائے

زندگی ہو صلیب ہو کہ چراغ
اب کسے چھوڑ کر جیا جائے

صلیب کی تاریخ سزا کی بھی ہے اور جزا کی بھی۔ یہ اس لیے کہ انسان نے اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اذیتیں دینے کا بھیانک ترین طریقہ صلیب کی شکل میں اپنایا یا دوسری طرف ریڈ کراس کی صورت میں یہ انسانی ہم دردی کا سب سے بڑا سمبل بن چکا ہے۔ صلیب کا یہ سمبل جب شاعری میں اُترتا ہے تو ہمارے عہد کی تنہائیوں آزمائشوں، ذہنی اداسیوں اور روحانی تکلیفوں کی علامت بن جاتا ہے۔

تاریخ سے علوی صاحب کو بے پناہ دل چسپی رہی ہے، وہ تاریخی شخصیات ہوں، مقامات ہوں یا خود تاریخ، اسے بنیاد بنا کر انھوں نے بیشتر نظمیں لکھیں لیکن ہر جگہ تاریخی حوالوں سے شکستہ قدروں اور مایوسیوں ہی کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ کے ایواں میں سر گنبد و محراب
مقتول چراغوں کی قطاروں کے سوا کیا

ایک بار اس کی وجہ دریافت کی تو بولے، "تاریخ کا مطالعہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ بہت زیادہ کیا ہے لیکن یوروپ، امریکا، افریقہ اور ایشیا کی اسٹڈی کے بعد پتہ چلا کہ روئے ارض پر انسان کی فکر، اس کی نظر، اس کے عمل اور نیت کی تاریخ پر بے طرح دھند لکے چھائے ہوئے ہیں دوسروں پر ظلم و زیادتی کمزوروں کے ساتھ ناروا سلوک، استحصال بے جا اور عدم توازن کی اتنی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ تاریخ مجھے صرف مقتول چراغوں کی قطار دکھائی دیتی ہے۔ اب اس میں فلسفیوں، رشیوں منیوں اور خدا کے نیک بندوں کا معاملہ الگ ہے جو اپنے دل کی روشنی کے ساتھ اسی طرح ان تاریکیوں میں سفر کرتے ہیں جیسے ہم کرمکِ شب تاب کو سفر کرتے دیکھتے ہیں۔"

تاریخ، ایواں اور گنبد و محراب میں تعلق ہی ایسا ہے کہ ایک کی کہانی دوسرے کے بغیر ادھوری سی رہتی ہے۔ تاریخ بہت سی چیزوں کی صحیح حقیقت سامنے لاتی

ہے لیکن ان سچائیوں کے پردے میں جو کچھ چھپا رہ گیا۔ یا مٹا دیا گیا وہی مقتول چراغوں کی کہانیاں ہیں جن کی وجہ سے ہمارا آج بھی اداس ہے اور تاریخ بھی۔

روشنیوں کی تلاش میں سورج اور چراغ ان کے یہاں بڑی علامتوں کے روپ میں آئے ہیں۔ لیکن اس طرح جیسے چراغ کی جگہ دل جلا ہو، نور کی یہ علامتیں جو دوسروں کے لیے روشنی ہیں، ان کے لیے صرف آگ، سورج محض شعلوں کا قفس ہے، جس میں وہ جلتا ہے، ذرّوں کو روشن کرتا ہے مگر ستاروں میں اس کا اپنا کوئی مقام نہیں۔ سورج اور چراغوں کا یہ سفر ان کی اپنی زندگی کی داستان بن گیا۔

شعلوں کے قفس میں کس سے کہئے
سورج کی طرح میں رہ رہا ہوں
وہ گداگر نہیں ہے سورج ہے
وہ جو پھرتا ہے در بدر تنہا

بدلتے ٹوٹتے رشتوں کی کشمکش ہمارے آج کے شاعروں کے یہاں بیحد شدت اختیار کر چکی ہے۔ وقت کا ساتھ دینے کی کوشش اور حالات کے دباؤ میں ساری پناہ گاہیں ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ روایتی رشتوں سے روایتی انداز میں ہم جڑے نہیں رہنا چاہتے اور اس کے باہر جو بے یقینی ہے وہ رسک لینے نہیں دیتی۔ یہاں منزلیں چاہے ایک ہوں لیکن سوچ کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ اسی کشمکش کو لے کر علوی صاحب نے بدلتے ناتوں کو "ٹوٹتے رشتوں کا موسم" کہہ کر پکارا جہاں، اپنوں کی دوستی ایک سزا کی روپ میں ملی۔

مدتوں میں نے دلوں پر ہی تو دستک دی ہے
اب کہاں جا کے بھلا خود کو پکارا جائے
ہمیں نے رشتۂ جاں سے دلوں کے چاک سئے
ہمیں لیے ہوئے دامن کا تار تار آئے

یہ شہر جاں بھی ہے بے جان پتھروں کا نگر
کہاں کہاں تجھے اے زندگی پکار آئے

آگے دیکھتی ہوں اس شاعر کا ایک خاص موضوع سخن حرف وقلم کی بات ہے قلم ہی وہ سچ اور ساتھی ہے جو ہر مرحلے میں رہنمائی کرتا ہے لیکن اس اکثر چھاؤں میں بیٹھ کر بھی جانے کیوں انھوں نے بکھرے حرفوں کو ٹوٹتے رشتوں کی طرح سمیٹا یہ صرف ان کے تاریخ کے مطالعے کا نتیجہ ہے یا زندگی کے تجربے بھی اسی طرح ان کے قلم کو چھوتے رہے کہ اپنے بعد انھیں اپنی تحریر کی کوئی جیتی جاگتی تصویر نظر نہیں آتی۔ مٹی کے حروف جو چراغوں کی طرح جیون پنتھ روشن کرتے رہے ٹوٹے تو بالکل ہی بکھر کے رہ گئے۔

ہم قلم کے ساتھ اے تنویر رخصت ہو گئے
اپنے پیچھے چھوڑ کر گمنام تحریروں کا رقص
نقش بے رنگ تھی، پتھر کی لکیروں کی طرح
میرے لفظوں کی کہانی، میری تحریر کی بات

جتنی بھی شاعری میں نے ان کی پڑھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک طرف تو اردو شاعری کی وہ روایت نظر آتی ہے جس کے رشتے غالب سے ملتے ہیں اور لمحوں کی خوشبو، نظموں کا مطالعہ اور کئی غزلوں کا بے پناہ حسن اور صاف تاثر بتاتے ہیں کہ فطرت سے یہ رشتے کالی داس اور دیگر ہندوی شعراء کے مطالعے کے بعد استوار ہوئے ہیں۔

میں نے شروع میں ہی ذکر کیا کہ انھوں نے بارہا فکرانگیز باتوں پر غزلیں لکھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علوی صاحب دوسروں کی گفتگو ہمیشہ بڑے دھیان سے سنتے ہیں اور جہاں کوئی لفظ فقرہ یا خیال کسی کی بات چیت کے دوران ان کی تخلیقی حسیت کو چھیڑتا ہے فوراً جیسے سوچ آن ہو جاتا ہے اور وہ اس پر شعر کہہ ڈالتے ہیں۔ بہر حال کہہ سکتی ہوں کہ تنویر احمد علوی کی شاعری، اس کی انفرادیت، اشاریت، آج کے عہد کے لیے بھی وجہ شناخت ہے، اور آنے والے وقت کے لیے بھی۔

(الف۔ سین)

غزلیں

غزل

شمعیں اشکوں کی جلانے کے لیئے زندہ ہوں
خلوتِ غم کو سجانے کے لیئے زندہ ہوں

قربتیں ہیں تو اذیّت کا مداوا کیا ہے
دوریاں دل کی بڑھانے کے لیئے زندہ ہوں

دل کا مقسوم ہیں پتّھر کی لکیریں پھر بھی
ان لکیروں کو مٹانے کے لیئے زندہ ہوں

موت کے بعد بھی میں جن سے جدا ہو نہ سکوں
ان صلیبوں کو اٹھانے کے لیے زندہ ہوں

جن کتابوں کے ورق میرا کفن بن نہ سکیں
ان کو آنکھوں سے لگانے کے لیئے زندہ ہوں

شہرِ جاناں کا ہے مقدّر یہی شیشے کا حصار
کب سے میں اسکو بچانے کے لیے زندہ ہوں

دِل گھروندے کی طرح ٹوٹ چکا ہے تنویر
جو نہیں ہے اسے پانے کے لیئے زندہ ہوں

۱۱ دسمبر ۱۹۸۷ء
دہلی

غزل

نسیمِ ناز کھِلاتی رہی حجاب میں پھول
ادا سے گرتے رہے ریشمی نقاب میں پھول
بکھر رہی ہے تبسّم سے آئینہ میں شفق
کھِلا رہی ہو دھنک جیسے رقصِ آب میں پھول
وہ تارِ زلف ہے افسانہ کہہ سکیں جس کو
یہ بجلیاں ہیں کہ ہیں دامنِ سحاب میں پھول
حسین لب ہیں وہ کہیے جنھیں گلِ نغمہ
یہ انگلیاں ہیں کھِلاتی ہیں جو رباب میں پھول
چھلک رہا ہے اُدھر لمس سے شیشۂ جاں
مہک رہے ہیں اِدھر ساغرِ شراب میں پھول
ورق ورق میں بسی ہے اُس ایک پل کی مہک
وہ رکھ کے بھول گیا تھا کبھی کتاب میں پھول
حسین یادوں کے یہ نقش تو نہیں تنویرؔ
کھِلے ہوئے ہیں عجب رہگزارِ خواب میں پھول

۱۳ مارچ ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

ہر طرف ہے کوچہ قاتل میں، دل گیروں کا رقص
کس سے کہیئے زندگی ہے کتنی تعزیروں کا رقص

اب کسی سے بھی تو جیسے درد کا رشتہ نہیں
نشتروں کی دل نوازی ہے نہ شمشیروں کا رقص

کاغذِ آتش زدہ میں، یہ مچلتی بجلیاں
کس سے کہیئے، ہے دلِ ناداں کی تصویروں کا رقص

دل دھڑکتا ہی رہا، اے زندگی تیرے لیے
اور ہم دیکھا کیے، کچھ نیم کش، تیروں کا رقص

میرا ماضی، دل پہ دستک دے رہا ہے بار بار
جیسے ہوتا ہو درِ زنداں پہ زنجیروں کا رقص

موم کے پھولوں کی صورت میں کھلے تھے دل کے داغ
دیدنی تھا ہر طرف محفل میں گلگیروں کا رقص

ہم قلم کے ساتھ اے تنویرؔ رخصت ہو گئے
اپنے پیچھے چھوڑ کر گمنام تحریروں کا رقص

۲ اپریل ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

کیا ضروری ہے کوئی "بے سبب آزار" بھی ہو
سنگ اپنے لیے، شیشہ کا طلب گار بھی ہو

دلبری حسن کا شیوہ ہے مگر کیا کیجیے
اب یہ لازم تو نہیں حسن، وفادار بھی ہو

زخم جاں، وقت کے کانٹوں سے بھی سِل سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ ریشم کا، کوئی تار بھی ہو

فاصلہ رکھیے، دلوں میں مگر اتنا بھی نہیں
درمیاں، جیسے کوئی آہنی دیوار بھی ہو

دو کناروں کی طرح ساتھ ہی چلتے رہیئے
اب ضروری تو نہیں کوئی سروکار بھی ہو

کوئی اس درد کے رشتے کو نبھائے کیوں کر
چارہ سازی جو کرے وہ کوئی غم خوار بھی ہو

شیشۂ جاں کو بچانے کی یہ کوشش تنویر
شاید اس شہرِ ستم کے لیئے بیکار بھی ہو

۶ مئی ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

سربلندی تو صلیبوں کا مقدر ہے یہاں
دیکھ لو سامنے محراب نہ منبر ہے یہاں

نہ کوئی نقش نہ ہیئت نہ کوئی سوز نہ ساز
"گیلی مٹی ہی" مری روح کا پیکر ہے یہاں

جس کی تقدیر میں ٹوٹا ہوا آئینہ ہو،
اس سے کیا کہیے کہ اب کون سکندر ہے یہاں

کوئی کانٹوں کا بھی دیتا ہے کسی کو تحفہ
دل میں رکھنے کو تو احساس کا نشتر ہے یہاں

دل کے ٹکڑے ہی اٹھا لاؤ صنم خانے سے
بت شکن تھا جو کبھی آج وہ آذر ہے یہاں

اب کسی موڑ کا آنا نہیں ممکن ٹھیرو
دور تک اب تو سرابوں کا سمندر ہے یہاں

آبگینہ لیے پھرتے ہو بغل میں تنویرؔ
دیکھنا ہاتھ میں ہر شخص کے پتھر ہے یہاں

۹ مئی ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

وہ شاعرِ مشرق ہو، یا شاعرِ المانی
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

پھولوں کے صحیفے بھی آنکھوں کے مقابل تھے
ہم کو ہی پسند آئی شمشیر کی عریانی

کاٹے سے نہیں کٹتی زنجیر خیالوں کی
جائے تو کہاں جائے احساس کا زندانی

کانٹوں کی حنابندی راس آگئی صحرا کو
دیکھی مرے اشکوں میں جب خون کی ارزانی

تعبیر تو ممکن ہے پتھر کی لکیروں کی
ممکن نہیں خوابوں کی پھر سلسلہ جنبانی

شعروں کے یہ پیکر بھی تاریخ ہیں یادوں کی
کچھ داغ تو باقی ہیں جذبے ہیں اگر فانی

کن بھول بھلیوں سے آئے ہو گذر کر تم
تنویر جو آنکھوں سے جاتی نہیں حیرانی

۱۰ مئی ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

شوخیاں برقِ ادا کی، وہ بھی دل گیروں کے ساتھ
زندگی کتنی حسیں ہے اپنی تعزیروں کے ساتھ

شیشہ در شیشہ بدن، اس پر چراغوں کا یہ رقص
پتھروں کے خواب اور پھولوں کی تعبیروں کے ساتھ

کس کے ہاتھوں کی لکیریں ہیں خطِ تقدیر میں
دل کے یہ سادہ ورق گمنام تحریروں کے ساتھ

سرد کی آزادیاں بھی، رنگ و بو نے چھین لیں
حسنِ بے پروا مگر ریشم کی زنجیروں کے ساتھ

وہ نگاہِ ناز ہے خمیازۂ زلفِ بہار
خوشبوئیں بھی روح کو چھوتی رہیں تیروں کے ساتھ

سائے تھے بڑھتے چلے آئے قدم اندر قدم
ورنہ کب نقشِ قدم چلتے ہیں راہ گیروں کے ساتھ

دل کا ویرانہ ہے یا تنویر کوئی بت کدہ
آئنے رکھے ہوئے اور وہ بھی تصویروں کے ساتھ

۱۲ر مئی ۱۹۸۸
دہلی

غزل

مشترک درد کے رشتوں میں وفا ہے بھی کہاں
تم جسے ڈھونڈ رہے ہو، وہ خدا ہے بھی کہاں

"یا اخی" کہہ کے بھلا کون پکارے گا تمہیں
دل کی دھڑکن کے سوا کوہِ ندا ہے بھی کہاں

کیسے اب اپنے خد و خال کو پہچانو گے
دل کے آئینہ میں پہلی سی جِلا ہے بھی کہاں

بے طلب جو بھی ملا اس کے سوا کیا ملتا
بے نیازی کے لیے دستِ عطا ہے بھی کہاں

داغِ جاں ہے تری خوشبو سے مہک اٹھتا ہے
دل کے پھولوں کے لیے دستِ صبا ہے بھی کہاں

آئینہ پھینک دے، جیسے کوئی تاریکی میں
یوں سزائیں تو بہت ہیں، یہ سزا ہے بھی کہاں

جس کو تنویر علاجِ غمِ دوراں کہیئے
تم سمجھتے رہو پر ایسی دوا ہے بھی کہاں

۱۶ جون ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

ہم صلیبوں کو لیے حدِّ ادب تک پہنچے
روشنی سب کے لیے ہے تو وہ سب تک پہنچے

وہ تعلّق کہ جیسے درد کا رشتہ کہیئے
کچھ ضروری تو نہیں، نام و نسب تک پہنچے

آرزو روح کی خوشبو ہے بکھر جائے گی
کیا ضروری ہے کہ وہ دستِ طلب تک پہنچے

روشنی اپنا مقدّر تھی مگر کیا کیجئے
ہم ستاروں کی طرح منزلِ شب تک پہنچے

دل کے پھولوں کے لیئے تیرے لبوں کا پیغام
کون جانے کہ وہ پہنچے بھی تو کب تک پہنچے

کربِ تخلیق کی یہ شیشہ گری اُسے توبہ
دل کے ٹکڑے ہوئے اور سازِ طرب تک پہنچے

تیری یادوں کا فسوں ہے کہ فسانہ تنویر
بات زلفوں سے چلے عارض و لب تک پہنچے

۱۳ جولائی ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

کس سے ہے درد کا رشتہ تری محفل کے سوا
فاصلے ہیں بھی کہاں پیار کی منزل کے سوا

شہرِ افسوس میں کس کس کو پکار آیا ہوں
کون فریاد سنے گا مرے قاتل کے سوا

رقصِ گرداب بھی ہے جیسے یہاں رقصِ سراب
پیاس ہے کس کا مقدر لبِ ساحل کے سوا

دور تک وادیٔ افکار کا یہ سناٹا
کوئی جھنکار نہیں رقصِ سلاسل کے سوا

وہ کہانی جو رگِ جاں کو بنا دے نشتر
کون دہرائے گا اس کو دلِ بسمل کے سوا

کس سے پگھلا ہے یہ سنگین حقائق کا طلسم
زندگی کچھ بھی نہیں اس زہرِ ہلاہل کے سوا

آئینہ بھی ہے نقابِ رخِ جاناں تنویرؔ
لطفِ نظارہ کہاں پردۂ محمل کے سوا

۷ ستمبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

عجیب شخص ہے پتھر سے پر بناتا ہے
دیارِ سنگ میں شیشہ کا گھر بناتا ہے

جو زخم پھول کی پتی کا سہ سکا نہ کبھی
اس آبلہ کو وہ اپنی سپر بناتا ہے

فضا کا بوجھ سمجھتا ہے چاند سورج کو
وہ گرد لوں پہ سجانے کو سر بناتا ہے

جہاں سے قافلۂ وقت راہ بھولا تھا
انہیں سرابوں میں وہ رہ گزر بناتا ہے

تراشتا ہے جگر وہ بھی آبگینوں سے
خزف کو کاسۂ عرضِ ہنر بناتا ہے

دل و نظر کے فسوں اس کو راس آ نہ سکے
وہ آئینوں سے گزرنے کو در بناتا ہے

یہ کس سے کہیئے کہ تنویرؔ خود صلیبوں کو
سکونِ جاں کیلئے ہم سفر بناتا ہے

۱۴ ستمبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

حرفِ دل مختصر ہو تو کیا کیجیے
وہ بھی نامعتبر ہو تو کیا کیجیے
مرے سجدے تو بکنے کی شے بھی نہیں
ایک ہی سنگِ در ہو تو کیا کیجیے
موم کے پر تھے اُن کو پگھلنا ہی تھا
دھوپ جب ہم سفر ہو تو کیا کیجیے
آبگینوں کو چھُونا تو مشکل نہیں
ان میں خونِ جگر ہو تو کیا کیجیے
میں صلیبوں کا تاجر نہیں دوستو
دل مسیحا کا گھر ہو تو کیا کیجیے
میرا نقشِ قدم مٹ بھی جائے تو کیا
وہ تری رہ گذر ہو تو کیا کیجیے
سانس لینا بھی مشکل ہے تنویرؔ اب
دل ہی جب شیشہ گر ہو تو کیا کیجیے

۲۵ ستمبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

پلکوں پہ حسیں خواب سجانے کے لیے ہیں
خوشبو میں تیری یاد دلانے کے لیے ہیں

یہ رات کی زُلفوں کے مہکتے ہوئے حلقے
بھولے ہوئے افسانے سُنانے کے لیے ہیں

ہونٹوں پہ تبسّم سے بکھرتا ہوا ریشم
وہ پھول جو آنکھوں سے لگانے کیلیے ہیں

گُذرے ہوئے لمحات کے یہ آئنہ خانے
یادوں کے دریچوں میں سجانے کیلیے ہیں

جو لمسِ صبا سے کبھی ہوں میلے وہ حسیں پھول
خوشبو کی طرح دل میں بسانے کے لیے ہیں

برگِ لب و عارض پہ یہ کھلتی ہوئی کلیاں
خوابیدہ بہاروں کو جگانے کیلیے ہیں

یہ چاند کے ہالے ہوں کہ خوشبوؤں کے طوفان
تنویرؔ دل و جاں میں چھپانے کے لیے ہیں

۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

ہم سرِ بزمِ وفا شمعِ فروزاں بھی رہے
چشمِ گریاں بھی رہے دیدۂ حیراں بھی رہے

مسکراتے بھی رہے تیری حسیں محفل میں،
ہم چراغوں کی طرح شعلہ بداماں بھی رہے

انہیں پلکوں پہ کھلے ریشمی یادوں کے گلاب
انہیں آنکھوں میں کئی خواب پریشاں بھی رہے

ہم ہی تھے خار بداماں بھی سرِ شاخِ گلاب
ہم ہی پھولوں کی طرح چاک گریباں بھی رہے

دل کو خوں کرنے پہ مجبور بھی تھے کیا کرتے
زندگی تیرے، لیے ہم ہی غزل خواں بھی رہے

دل کے داغوں سے سرِ بزم چراغاں بھی کیا
دل کے داغوں کی طرح سوختہ ساماں بھی رہے

پھول صحرا میں کھلاتے رہے، ہم آبلہ پا
اس پہ منت کشِ صد خارِ بیاباں بھی رہے

۲۸ ستمبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

زندگی بھول بھلیوں کا سفر ہو جیسے
وقت خوابوں کی نئی راہگذر ہو جیسے

کیا خلش ہے کہ حسیں یاد بنی جاتی ہے
دل میں پیوست کوئی تیرِ نظر ہو جیسے

آبگینوں کی یہ بستی ہے جسے دل کہیے
شہرِ جاں بھی کوئی شیشے کا نگر ہو جیسے

اس کو پلکوں سے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے
وہ حسیں پھول بھی "ممنوعہ شجر" ہو جیسے

فاصلہ رکھیئے دلوں میں مگر اتنا بھی نہیں
چاکِ دامن ہی نہیں چاکِ جگر ہو جیسے

دور تک دل کے چراغوں کا سفر جاری ہے
پھر بھی ہر نقشِ قدم خاک بسر ہو جیسے

آگ کے پھول ہی چننے کو ملیں گے تنویر
زندگی شعلوں کی وادی کا سفر ہو جیسے

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

اشک آنکھوں میں جو بھر آئے تو قاتل ٹھیرے
ہم تری چشمِ فسوں گر کے مقابل ٹھیرے

جو چراغوں کا مقدّر ہے وہی اپنا ہے
ہم تو جلنے کے لیے رونقِ محفل ٹھیرے

جیسے شعلوں میں چھپا دے کوئی خوشبو کا بدن
دل کے یہ زخم میری زیست کا حاصل ٹھیرے

قید سے زلفِ گرہ گیر تو آزاد رہی
ہم ہی دیوانے تھے جو پابہ سلاسل ٹھیرے

تیرے انفاس کی خوشبو تری آواز کا لمس
کوئی تو وجہِ سکوں ہو کہ مرادِ دل ٹھیرے

برق گرتی ہے قفس پر بھی نشیمن کی طرح
دل سے شعلے جو اٹھے رقصِ عنادل ٹھیرے

کس سے تنویرؔ یہ کہیئے کہ قفس جلتا ہے
اب کہ شعلے ہی نشانِ سرِ منزل ٹھیرے

۱۸/اکتوبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

کیسے اس شہر میں تم رہتے ہو مہماں کی طرح
تم کہ حساس بھی ہو آج کے انساں کی طرح

زندگی کس نے گذاری ہے یہاں ناز کے ساتھ
خمِ ابرو کی طرح، کاکلِ پیچاں کی طرح

شبنمِ صبح کی صورت ہے گہر، آبلہ پا
رگِ گل میں ہے خلشِ خارِ مغیلاں کی طرح

دھوپ چھاؤں کا حسیں کھیل یہ رقصِ لمحات
شام گیسو کی طرح صبحِ زرافشاں کی طرح

ریشمی لمس کی یادوں میں بھی ہے رنگِ حنا
دل کی خوشبوئیں بھی ہیں سنبل و ریحاں کی طرح

اس کی پلکوں کا مقدر نہیں خوابوں کی شکست
آئینہ یوں تو ہے اس دیدۂ حیراں کی طرح

کس سے یہ کہیئے کہ تنوبرِ سرِ دشتِ وفا
زندگی آج بھی ہے رقصِ غزالاں کی طرح

یکم نومبر ۱۹۸۸ء
دہلی

غزل

برقِ محمل بھی نہیں، لالۂ صحرا بھی نہیں
دل کی قسمت میں چراغِ رخِ زیبا بھی نہیں

پھر بھی، ہر سمت، سرابوں کا سفر جاری ہے
گردِ اس شہرِ حسیں کے کوئی صحرا بھی نہیں

آج، بے چہرگیٔ وقت کی پہچان ہوں میں
یوں تو بے چہرہ یہاں کوئی سراپا بھی نہیں

اب ترے زہر کا تریاق کہاں سے آئے
اب کسی ہاتھ میں سقراط کا پیالہ بھی نہیں

قطرہ قطرہ ہے مرے خون کا زہرابِ وفا
اور غیروں کا لہو اس کا مداوا بھی نہیں

آج سناٹوں کی بستی ہے یہ دل کی محفل
رقصِ زنجیر تو کیا قلقلِ مینا بھی نہیں

دل کے ٹکڑے لیے پھرتے ہو کہاں اے تنویر
کوئی اس شہر میں شیشوں کا مسیحا بھی نہیں

۱۴ر نومبر
۱۹۸۸ء

غزل

زندگی مہوشوں کی چاہ تو ہو
آئینہ ہم نشینِ ماہ تو ہو

دلِ ناداں کا ساتھ ہی دیجے
رقصِ زنجیر سے نباہ تو ہو

تابِ رخسار ہو کہ برقِ نگاہ
کوئی شعلہ نشانِ راہ تو ہو

خواب شیشے کے بت تھے ٹوٹ گئے
کچھ نہ ہو فرصتِ نگاہ تو ہو

بجلیاں لاکھ دل پہ لہرائیں
سایۂ زلف کی پناہ تو ہو

ہم سزاؤں کو بھی حسیں سمجھیں
زندگی میں، کوئی گناہ تو ہو

خود شکن بن گئے ہو تم تو ذرا
کوئی اب تم سے، داد خواہ تو ہو

۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء
بوقت شب دہلی

غزل

اب سرِ سودا زدہ کو کیوں کوئی پتھر ملے
اور رگِ جاں کے لیئے احساس کا نشتر ملے

کیا ضروری ہے مرے آوارہ سجدوں کیلیئے
کوئی نقشِ پا بھی ہو یا کوئی سنگِ در ملے

اپنی راہوں کی تھکن کو اوڑھ کر سو جایئے
ہر مسافر کو یہ لازم تو نہیں بستر ملے

محشرستانِ جہاں میں جتنے سر تھے جھک گئے
جو سوا نیزے پہ ہو ایسا بھی کوئی سر ملے

ہے سمندر ہی پہ کیا موقوف لہروں کی شناخت
کتنی لہریں ہیں سرابوں کی جنہیں پیکر ملے

زندگی بے چہرگی کے ساتھ ہی جی لیجیئے
کیا ضروری ہے کہ ہر پتھر کو اک آذر ملے

سر کے بل چلتا رہے جو زندگی بھر آگ میں
کون اب تنویرؔ تم سا کوئی بازی گر ملے

۱۴ فروری ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

دل میں یادِ دیارِ دلجو کو تو باقی رکھیے
زندگی میں کسی خوشبو کو تو باقی رکھیے

دوستی اب نہیں شکوہ کو بھی جانے دیجیے
ہم نشینوں کی سی خوبو کو تو باقی رکھیے

دل کی خوشبو ہی تو وحشت کا سبب ہے پھر بھی
دشتِ جاں میں رمِ آہو کو تو باقی رکھیے

لفظ و معنی نہیں لہجہ کا ترنم ہی سہی
گفتگو میں کسی جادو کو تو باقی رکھیے

چشمِ خوں بستہ کا اب دور نہیں ہے نہ سہی
مسکراتے ہوئے آنسو کو تو باقی رکھیے

وقت ٹوٹے ہوئے خوابوں کا فسانہ ہی سہی
صبحِ عارض، شبِ گیسو کو تو باقی رکھیے

میری مجبوری کو بھی طرزِ ستم کہہ لیجیے
شکنِ لب، خمِ ابرو کو تو باقی رکھیے

دل کے رشتے تو بدلتے ہی رہیں گے تنویر
دلدہی کے کسی پہلو کو تو باقی رکھیے

۲۷ مارچ ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

ذہن زندہ ہے مگر اپنے سوالات کے ساتھ
کتنے الجھاؤ ہیں زنجیرِ روایات کے ساتھ

کون دیکھے گا یہاں دن کے اجالوں کا ستم
یہ ستارے تو چلے جائیں گے سب رات کے ساتھ

جانے کس موڑ پہ منزل کا پتہ بھول گیے
ہم کہ چلتے ہی رہے گردشِ حالات کے ساتھ

وقت کرتا ہے بھلا کس سے یہاں حسنِ سلوک
وہ بھی اس دور میں قانونِ مکافات کے ساتھ

وہ تو خنجر تھا گلے جس نے لگایا ہم کو
ورنہ پیش آتا ہے اب کون مدارات کے ساتھ

حادثے ہیں تو انہیں پیش بھی آنا ہے ضرور
وہ بھی اُس شوخ سے تقریبِ ملاقات کے ساتھ

کون سنتا ہے یہاں دل کی کہانی تنویر
وہ بھی خوشبوؤں کے موہوم اشارات کے ساتھ

۱۰ اپریل ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

آج تنہائی میں خود ہی کو پکارا جائے
وقت تو وقت ہے اب کیسے گذارا جائے

مدتوں میں نے دلوں پر ہی تو دستک دی ہے
اب کہاں جا کے بھلا خود کو پکارا جائے

دل کے اس شہرِ مقدس کے اندھیرے توبہ
پھر چراغوں کو صلیبوں سے اتارا جائے

افقِ دل پہ چمکتی ہے جو یہ برقِ ادا
اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا جائے

دیکھنا یہ ہے کہ اس جُرمِ وفا کی خاطر
اب کسے کوچۂ قاتل میں پکارا جائے

دل کا پتھر تو نہیں ہے کہ تراشیں جس کو
اب ہوا پر ہی کوئی نقش ابھارا جائے

کتنی بے رنگ ہے تنویر یہ تصویرِ حیات
اب اسے دل کے لہو سے ہی سنوارا جائے

۷ جولائی ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

زخمِ جاں آج بھی خونابہ فشاں ہے کہ جو تھا
ہر نفس روح پہ اک بارِ گراں ہے کہ جو تھا

دل پہ احساس کی تلوار تھی؟ چلتی ہی رہی
اور ذہن آج بھی بے تیر و کماں ہے کہ جو تھا

اب وہ قصّے، وہ طلسمات نہیں ہیں، نہ سہی
وقت تو آج بھی اک سیلِ رواں ہے کہ جو تھا

ہیں اسی راہ میں تا دور صلیبوں کے نشاں
جس میں اب تک وہی اندیشۂ جاں ہے کہ جو تھا

اب وہ تعویذ نہیں، نقش نہیں، لوح نہیں
حسن اب بھی وہی آشوبِ جہاں ہے کہ جو تھا

اس پہ منقوش ہیں صدیوں کی الف لیلائیں
اور یہ دل آج بھی بے نام و نشاں ہے کہ جو تھا

زندگی بھول بھلیوں کا سفر ہے تنویر
"وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا"

۱۰ اگست ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

زندگی خار بداماں ہے گریباں کی طرح
دل کی خوشبو ہے مگر خواب گریزاں کی طرح

خلوتِ ناز کو افسانہ و افسوں کہیئے
رات بھی رقص میں ہے زلف پریشاں کی طرح

روشنی آئینہ مانگے بھی تو کس سے مانگے
داغ جلتے ہیں کئی یوں مہِ تاباں کی طرح

موم کے تن کو ملے آگ کے پھولوں کا لباس
جلتے رہنے کے لیئے شمعِ شبستاں کی طرح

ریشمی لمس کی یادوں میں بھی ہے رنگِ حنا
دستِ پُر شوق بھی ہے سنبل و ریحاں کی طرح

یہ سرابوں کا نگر ہے کہ دلوں کی بستی
وسعتیں جس کا مقدر رہیں بیاباں کی طرح

کس سے یہ کہیئے کہ تنویر سرِ دشتِ وفا
زندگی آج بھی ہے رقصِ غزالاں کی طرح

[بوقت صبح پانچ بجکر پانچ منٹ]

۲ ستمبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

دل کے افسانے کو دُہراؤ گے کیا رہنے دو
تارِ دامن میں تو خوشبوئے وفا رہنے دو

پھول کھلتے ہیں کہاں جیب وگریباں کی طرح
وادیٔ جاں میں یہی رقصِ صبا رہنے دو

ہم نقابوں کے پرستار ہیں چہروں کے نہیں
شہرِ دل میں یہی بازار سجا رہنے دو

دل نہیں ہے تو کوئی خون کا قطرہ ہی سہی
شاخِ مژگاں پہ یہی پھول کھلا رہنے دو

ہے نشانے کی بلندی تو یہاں نقشِ صلیب
اس بلندی سے نہ دو مجھ کو صدا رہنے دو

وقت کی تیز ہواؤں سے نہ کھیلو، دیکھو
بجھ نہ جائے یہ کہیں شمعِ وفا رہنے دو

اب دُعا ہو کہ دوا کام نہ دے گی تنویرؔ
دل کو بیمار ہی تم بہرِ خدا رہنے دو

۱۶ ستمبر ۱۹۹۹ء
دہلی

غزل

نگہِ ناز میں افسانے سمٹ آتے ہیں
گوشۂ دل میں صنم خانے سمٹ آتے ہیں

آرزوئیں میں کیا کرتی ہیں یاد کا طواف
حلقۂ نور میں پروانے سمٹ آتے ہیں

جیسے چھو لے کوئی پلکوں سے حسیں خوابوں کو
اُس خمِ زلف میں، مے خانے سمٹ آتے ہیں

کس سے کہیئے کہ ترے لمس کی خوشبو کی طرح
دستِ گل خوردہ میں، پیمانے سمٹ آتے ہیں

کچھ عجب چیز ہیں محرابِ حرم کے جلوے
سجدۂ شوق میں بُت خانے سمٹ آتے ہیں

وادئ جاں ہے بہت خاک اُڑانے کیلیے
دامنِ دشت میں دیوانے سمٹ آتے ہیں

دل کی آبادی کا مذکور ہی کیا ہے تنویرؔ
شہرِ افسوس میں ویرانے سمٹ آتے ہیں

۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۹ء
علی گڑھ سے دہلی آتے ہوئے

غزل

دل کی دھڑکن کو بھی یادوں کی کہانی کہیئے
وہ کہانی' جسے خوشبو کی زبانی' کہیئے

جو کبھی آگ تھا پھولوں کے شراروں کی طرح
اب تو اس خونِ رگِ جاں کو بھی پانی کہیئے

وہ چراغوں کی لڑی بھیگی ہوئی راتوں میں
جس کو شبنم نہیں' اشکوں کی روانی کہیئے

یہ وہ خوشبو ہے کہ لمحوں میں بکھر جائیگی
کس سے سلجھی ہے جسے زلفِ معانی کہیئے

چمپئی صبح کی خوشبو کو' صبوحی لکھیئے
سرمئی شام کی پوشاک کو دھانی کہیئے

بھیگی پلکوں کے تو' انداز کوئی کیا جانے
دلِ برباد کی' اب کِس کو نِشانی' کہیئے

وہ ستاروں کا مقدر نہیں جس کو تنویر
چشمِ خوں بستہ کی' خونابہ فشانی' کہیئے

۵؍اکتوبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

غمِ جاں کی، کوئی تدبیر نہیں ہے نہ سہی
زندگی ردکشِ تقدیر نہیں ہے نہ سہی

بجلیاں دل پہ چمکتی ہیں یہی کیا کم ہے
ان کمانوں میں کوئی تیر نہیں ہے نہ سہی

ہم بھی سایے کی طرح ساتھ چلے جائیں گے
وقت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے نہ سہی

زہرِ غم بھی تو ہے اندوہِ وفا کا تریاق
آہ میں اب کوئی تاثیر نہیں ہے نہ سہی

دل کے اب ٹوٹتے رشتے بھی ہیں انعامِ وفا
زخمِ جاں اب کوئی جاگیر نہیں ہے نہ سہی

اس کا پیغام تو ہے اے نفسِ بادِ سحر
خوشبوؤں کی کوئی تحریر نہیں ہے نہ سہی

شہرِ احساس صلیبوں کا نگر ہے تنویرؔ
سنگ اور خشت کی تعمیر نہیں ہے نہ سہی

۱۶/ اکتوبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

میں درد و کرب کا پیکر رہا ہوں
رگِ احساس کا نشتر رہا ہوں

لبِ سقراط سے نسبت ہے جس کو
میں وہ زہراب کا ساغر رہا ہوں

وہ جس پر قتل گاہوں کے نشاں ہیں
میں بت خانے کا وہ پتھر رہا ہوں

جو پار اترا ہے جلتی رسیوں سے
میں وہ جذبے کا بازی گر رہا ہوں

تراشے ہیں صنم خوابوں سے جس نے
نگاہوں کا میں وہ آذر رہا ہوں

لکھے ہیں قاتلوں کے نام جس پر
میں وہ تہذیب کا محضر رہا ہوں

جو کاغذ کے کھلونے بیچتا تھا
میں وہ فنکار و صورت گر رہا ہوں

مری قیمت شکستِ دل ہے تنویر
کہ چشمِ نم کا میں گوہر رہا ہوں

۱۳/اکتوبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

یہ جگنوؤں نے جلائے ہیں کیا، ڈگر میں چراغ
قدم قدم پہ ہیں روشن رہِ سفر میں چراغ

یہ زخم زخم مجورِ رقصِ لہو کا منظر ہے
اسی لہو نے جلائے ہیں، بال و پر میں چراغ

یہ داغِ عشق و عقیدت ہیں کون مانے گا
جلا دیئے ہمارے سجدوں نے سنگِ در میں چراغ

یہ میری آبلہ پائی کا فیض ہے شاید
جلے گا کون بھلا، لیکے یوں سفر میں چراغ

جگر کے داغ، نقوشِ بہارِ ناز بھی ہیں
جلے ہیں ورنہ کہاں، آہِ بے اثر میں چراغ

انہیں کے دم سے ہے یادوں کا جشن کیسے جسے
جلا کے چھوڑ گیا کون مرے گھر میں چراغ

یہ اشک پانی کی بوندیں سہی مگر تنویر
وہ خونِ دل ہے جلاتا ہے جو نظر میں چراغ

یکم نومبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

داغِ حسرت بھی نہیں زخمِ تمنا بھی نہیں
اب تو جینے کے لیئے کوئی تقاضا بھی نہیں

ریت پر خون کے قطرات کی زنجیر تو ہے
دور تک اور کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں

یہ صلیبیں تو کوئی روز بناتا ہوگا
اور مسیحائی سے اُسکا کوئی رشتہ بھی نہیں

تم ہو وہ پھول جو برسوں میں کبھی کھلتا ہے
دیر تک سامنے آنکھوں کے جو رہتا بھی نہیں

اجنبی شہر ہے دیکھو گے یہ چہرے کب تک
تم کو اِس بھیڑ میں کھو جانے کا خطرا بھی نہیں

دست و دامن پہ ہیں کس کس کے لہو کے چھینٹے
اور اس شہرِ ستم میں کوئی رسوا بھی نہیں

غیر ہو جیسے وہ اس شہر نظر میں تنویرؔ
آئینہ ہے تو مگر اپنا شناسا بھی نہیں

۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

دل ہے پلکوں میں سمٹ آتا ہے آنسو کی طرح
ریشمی رات کی بھیگی ہوئی خوشبو کی طرح

زندگی آج ہے یادوں کے تعاقب میں رواں
ریت کے ٹیلوں پہ گردِ رمِ آہو کی طرح

آن کی آن میں تاریخ بدل جاتی ہے
شکنِ زلف کی صورت خمِ ابرو کی طرح

تولنے کے لیے پھولوں کی ترازو بھی تو ہو
فکر و احساس بھی تل جاتے ہیں خوشبو کی طرح

شہر افسوس میں اپنے ہیں نہ بیگانے ہیں
اب دل و جاں کے بھی دشمن ہیں من و تو کی طرح

بجلیاں ہیں کہ چمکتی ہیں رگِ جاں کے قریب
جامِ صہبا کی طرح، حلقۂ گیسو کی طرح

تیری یادوں کی کہانی تو نہیں ہے تنویر
دل پہ دستک جو دیا کرتا ہے خوشبو کی طرح

۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ء
دہلی

غزل

وہی جو راہ کا پتھر تھا، بے تراش بھی تھا
وہ خستہ جاں ہی کبھی آئینہ قماش بھی تھا

لہو کے پھول رگِ جاں میں جس سے کھلتے تھے
وہی تو شیشۂ دل تھا کہ پاش پاش بھی تھا

بکھر گئی ہیں جہاں ٹوٹ کر یہ چٹانیں
یہیں تو پھول کوئی صاحبِ فراش بھی تھا

اٹھائے پھرتا تھا جس کو صلیب کی صورت
وہی وجود تو خود اس کی زندہ لاش بھی تھا

پلک جھپکنے میں کچھ خواب ٹوٹ جاتے ہیں
جو بت شکن ہے وہی لمحہ بت تراش بھی تھا

وہ حرفِ ناز کہ ریشم کا تار کہیے جسے
وہی تو دل کے لیے اک حسین خراش بھی تھا

ادائے حسن جسے کہیے بے رخی تنویرؔ
اسی سے طرزِ تغافل کا راز فاش بھی تھا

۵ فروری ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

جنوں کا سلسلہ ہے بھی تو رقصِ آرزو تک ہے
یہ رقصِ آرزو خود بھی فریبِ رنگ و بو تک ہے

قفس کی تیلیاں تقدیر ہیں شاخِ نشیمن کی
کہ ہر زنجیر کا حلقہ مرے طوقِ گلو تک ہے

مرے پاؤں کے چھالے خود نشاناتِ سفر بھی ہیں
ہجومِ نامرادی، خار خارِ جستجو تک ہے

مرے اشکوں کی لڑیاں ہی چراغوں کی قطاریں ہیں
کہ جشنِ تیرگی بھی ہے تو زلفِ مشک بو تک ہے

میں خوشبو ہوں بکھرنا ہے مجھے انجان راہوں میں
یہ میری خود گرفتاری مرے ذوقِ نمو تک ہے

بھلا اب آگ کے یہ پھول چننے کون آئے گا
بہاروں کا یہ ہنگامہ مرے رقصِ لہو تک ہے

شکستِ دل کا موسم ٹوٹتے رشتوں کا موسم ہے
شکستِ دل کا موسم بھی وداعِ آرزو تک ہے

دلوں کی دھڑکنوں سے اب کہانی کون سنتا ہے
یہ رسم و راہ بھی تنویرؔ گفتگو تک ہے

۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

برقِ نظر کی، پردۂ محمل کی بات تھی
یہ کون کہہ رہا تھا کہ وہ دِل کی بات تھی

خوشبو کسی کی لے گئی ہم کو کشاں کشاں
سب کے لبوں پہ دوریِٔ منزل کی بات تھی

جو دل کی دھڑکنوں کی کہانی سنا گئی
وہ داستاں نہ تھی تری محفل کی بات تھی

یہ بخششوں کا دور نہیں، مان لیجیے
جو چھو سکی نہ دل کو وہ سائل کی بات تھی

جس کے لہو کی آنچ سے خنجر پگھل گئے
وہ برق کی نہیں دلِ بسمل کی بات تھی

جو اپنی زندگی کا حوالہ نہ بن سکی
رقصِ جنوں کی سازِ سلاسل کی بات تھی

تنویرؔ کہتے کہتے اسے بھول کیوں گئے
ہونٹوں پہ کس کے غمزۂ قاتل کی بات تھی

۱۹ رمئی ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

ہے وادیٔ جاں غم کے نظاروں کے سوا کیا
اور شہرِ دلِ افسردہ بہاروں کے سوا کیا

یہ پھول ہیں زخموں کے جو کرتے ہیں چراغاں
محفل تری ہم سینہ فگاروں کے سوا کیا

تاریخ کے ایواں میں سرِ گنبد و محراب
مقتول چراغوں کی قطاروں کے سوا کیا

گذرے ہوئے لمحات کے یہ آئینہ خانے
اب ہیں بھی تو بے نام اداروں کے سوا کیا

آوارۂ افلاک ہیں یہ چاند ستارے
افلاک بھی خود کہنہ حصاروں کے سوا کیا

تدبیر بجز شیشہ گری ہے بھی تو کیا ہے
تقدیر بھی موہوم اشاروں کے سوا کیا

یادوں کی یہ تنویرِ حسیں کاہکشائیں
کچھ بھولی ہوئی راہ گذاروں کے سوا کیا

۲۰ جون ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

جب کبھی دوش پہ وہ زلفِ رسا آتی ہے
پا بہ زنجیر یہ کہئیے کہ صبا آتی ہے

تیرے دامن پہ مرے خون کے چھینٹے تو نہ تھے
آج تک اُس سے مگر بوئے وفا آتی ہے

حادثہ کوئی گذرتا ہے جو آئینے پر
ٹوٹنے کی دلِ محزوں سے صدا آتی ہے

اب عذابوں ہی کو سہنے کا سلیقہ سیکھو
جب دُعا آتی ہے تم کو نہ دوا آتی ہے

"یا اخی" کہہ کے بھلا کون پکارے گا یہاں
کوہ سے لوٹ کے اپنی ہی ندا آتی ہے

یادِ ماضی ترے ہاتھوں کے حسیں لمس کے ساتھ
جب بھی آجاتی ہے خوشبوئے حنا آتی ہے

خون سستا ہے یہاں زہر گراں ہے تنویر
سوچ لو کیا تمھیں جینے کی ادا آتی ہے

۱۸ جولائی ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

نکہتیں اور گلِ صبا کی طرح
صُبح کی ریشمی ردا کی طرح

تیر جاتی ہے وہ نِگہ دل میں
وہ بھی اک خنجرِ ادا کی طرح

وقت کی وسعتوں میں گُم ہو کر
لوٹ آئیں گے ہم صدا کی طرح

یوں ہی تسکینِ روح کی خاطر
مانگ لو ہم کو بھی دُعا کی طرح

تھام لو بڑھ کے برق کا دامن
وہ بھی اک یارِ آشنا کی طرح

جس کو اپنوں کی دوستی کہیئے
وہ بھی ہم کو ملی سزا کی طرح

وہ نشاناتِ راہ تھے تنویر
مٹ گئے ہیں جو نقشِ پا کی طرح

۸ راگست ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

کیا وقت گذر گیا ہے یارو
دیوانہ جو کر گیا ہے یارو

جو موم کے پھول چن رہا تھا
شعلہ وہ کدھر گیا ہے یارو

دستک جو دلوں پہ دے رہا تھا
چپکے سے گذر گیا ہے یارو

چہرے پہ لکھی ہے جس کے تاریخ
وہ کہہ کے مکر گیا ہے یارو

ذرات تو رقص میں ہیں لیکن
سورج ہی بکھر گیا ہے یارو

نشتر وہ شکست آرزو کا
اب دل میں اتر گیا ہے یارو

تنویر نے پی لیا تھا جو زہر
اب کام وہ کر گیا ہے یارو

۱۱ اگست ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

یوں تو کہنے کو ہے یہ صحنِ حرم
آستینوں میں ہیں یہاں کئی صنم

راہ میں دور تک اندھیرا ہے
بجھ گئے سب چراغِ نقشِ قدم

کچھ نہ ہوتا تو صبر ہی کرتے
وہ بھی ساماں ہو سکے نہ بہم

زخم راہوں کے مندمل نہ ہوئے
خونِ دل بھی نہ بن سکا مرہم

وہ بھی مٹی کا بت تھا دل تو نہ تھا
وہ جسے کہئیے شیشہ و شبنم

بن کے ظالم بھی کیا ملے گا تمھیں
کس پہ اپنے سوا کروگے ستم

لمس ہے کس کی یاد کا تنویر
دل کو چھو کر گذر گیا ریشم

۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

کیا کیجیے وہ دشتِ وفا یاد نہ آیا
ہم بھول گئے، کوہِ ندا یاد نہ آیا

جو کچھ تھا وہ ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا تھا
اور اس کے سوا حرفِ دُعا یاد نہ آیا

تھامے ہیں بہت ہاتھ تو اُس دستِ تہی نے
صد شکر کوئی دستِ عطا یاد نہ آیا

راہوں کے خم و پیچ سے گذرا تو ہوں اکثر
کھوئی ہوئی منزل کا پتہ یاد نہ آیا

وہ پھول لہو کے تھے جو کانٹوں میں کھِلے تھے
اس پر بھی کوئی آبلہ پا یاد نہ آیا

اب یوں بھی دھڑکتا ہوا دل کس کو ملا ہے
کہنے کو یہ آشفتہ نوا یاد نہ آیا

ناکردہ گناہوں کی سزائیں تو نہ ملتیں
تجھ کو تیرا نہیں جرمِ وفا یاد نہ آیا

۸ر نومبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

وہی جن کی شکایت کر رہے ہو
اُنہیں کانٹوں سے دامن بھر رہے ہو

جو پتھر میں دوبارہ ڈھل گیا ہے
تم احسیّت کا وہ پیکر رہے ہو

کوئی واقف بھی ہو تم سے کیوں کر
کہ آئینہ کا پس منظر رہے ہو

سفر ہو جیسے آبی دائروں کا
تم اپنا آپ ہی محور رہے ہو

تمہیں آتی بھی کیسے بت تراشی
کہ تم اپنے ہی صورت گر رہے ہو

شہابوں کی طرح سے ٹوٹ کر بھی
بگولوں کی طرح خود سر رہے ہو

یہ شکوہ بھی کہاں جائز ہے تنویر
کہ تم محرومِ بال و پر رہے ہو

۹ نومبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

رقصِ دل کچھ بھی نہیں، نغمۂ جاں کچھ بھی نہیں
نفسِ شوق کا یہ سازِ فغاں کچھ بھی نہیں

دل کی دھڑکن ہے وہ، زنجیرِ صدا کہیئے جسے
یہ بیاں کچھ بھی نہیں ہے، یہ زباں کچھ بھی نہیں

خواب در خواب ہے خود بھی یہ حقیقت یہ مجاز
یہ نہاں کچھ بھی نہیں ہے، یہ عیاں کچھ بھی نہیں

دیدہ و دل ہیں جنہیں شعلہ و شبنم کہیے
تارِ مژگاں ہے کہ جز اشکِ رواں کچھ بھی نہیں

زندگی ہے وہ، جسے شیشۂ ساعت کہیئے
رقصِ لمحات بجز ریگِ رواں کچھ بھی نہیں

نقش تھے کتنی صلیبوں پہ مسیحاؤں کے نام
مڑ کے دیکھا تو یہاں نام و نشاں کچھ بھی نہیں

پتھروں پر یہ لکیریں تو رہیں گی تنویرؔ
نقش موہوم ہے نقشِ دل و جاں کچھ بھی نہیں

۹ نومبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

یہ داغِ آرزو ہے کہاں تک مٹاؤ گے
کیا اپنے عکس کو بھی نشانہ بناؤ گے

ہیں کتنی بے چراغ لہو کی یہ سرحدیں
اُن سے گذر بھی جاؤ تو کس سمت جاؤ گے

یہ رات وہ نہیں ہے کہ دامن سمیٹ لے
یہ آنسوؤں کی شمعیں بھی کب تک جلاؤ گے

جب پھول سی نگاہیں بھی پتھر میں ڈھل گئیں
یہ دل کا آئینہ بھی کہاں لے کے جاؤ گے

ہنس کر یہ زہرِ غم کا پیالہ تو پی لیا
کیسے جیو گے یوں بھی اگر مر نہ پاؤ گے

یہ زخمِ جاں نہیں ہے کہ شعلوں میں چھپ گئے
خوشبو میں دل کے درد کو کیسے چھپاؤ گے

تنویر شہرِ سنگ میں "دل کے معاملے"
شیشے کے بت ہیں تم انھیں کیسے بچاؤ گے

۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

ہوسِ عز و جاہ کس کو ہے
خواہشِ مہر و ماہ کس کو ہے

سب کے ہاتھوں میں آئینے ہیں مگر
فرصتِ یک نگاہ کس کو ہے

کس نے دل میں چھپا لیا خنجر
اعترافِ گناہ کس کو ہے

کس کے سر پر ہے سایۂ دیوار
نازِ تاج و کلاہ کس کو ہے

حرفِ ناآشنا ہے دل کی زباں
اس میں اب اشتباہ کس کو ہے

کس کی قسمت میں ہے سرابِ وجود
شکوۂ زادِ راہ کس کو ہے

کون مانگے ہے خوں بہا تنویرؔ
ہوسِ قتل گاہ کس کو ہے

۲۹ نومبر ۱۹۹۰ء
دہلی

غزل

جو بات ہو نہیں سکتی، وہ بات مانگے ہے
اسیرِ زلف سے پھولوں کی رات، مانگے ہے

یہاں حرم ہی نہیں خود حریمِ جاں بھی تو ہے
جو دل کے سجدوں کو لات و منات، مانگے ہے

عجیب شخص ہے تنہا سفر کی راہوں میں
صنم کدوں کی حسیں کائنات، مانگے ہے

یہ دل تو دل ہے ترا آئنہ نہیں پھر بھی
نظر نظر میں نیا التفات مانگے ہے

لہو کی بوند جو بکھری ہے وادیٔ جاں میں
شفق نہیں ہے مگر شبہات مانگے ہے

لبوں کو چھو نہ سکے اور دل میں چُبھ جائے
یہ خامشی تو کوئی واردات، مانگے ہے

یہ کس کے لہجے پہ شیریں کی بات ہے تنویر
جو تلخیوں سے بھی قند و نبات مانگے ہے

۱۸ر اپریل ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

گرہِ زلف سے خوشبوئے وفا مانگے ہے
دل کی تقدیر ہے کیا اور یہ کیا مانگے ہے

منتظر آنکھوں میں صدیوں کی تھکن کہیے جسے
تیرے دزدیدہ تبسم کی ردا مانگے ہے

کیا قیامت ہے کہ یہ کشتۂ اندوہِ وفا
کوچۂ زلف میں بھی رقصِ بلا مانگے ہے

تازیانوں نے لکھی اُس کے بدن پر تاریخ
وہ جو ناکردہ گناہوں کی سزا مانگے ہے

دل کے پھولوں سے گزرتی ہوئی ریشم کی لکیر
آئنہ آئنہ اک برقِ ادا مانگے ہے

مسکراتی ہوئی یادوں طربناک خلش
دل کے چھالوں سے بھی کانٹوں کی نما مانگے ہے

آرزو بوئے رمیدہ کا نشاں ہے تنویر
زندگی دشتِ غزالاں کی فضا مانگے ہے

۱۱ مئی ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

آئنہ آئنہ مگر تنہا
آج ہے حُسنِ فتنہ گر تنہا

دل کی ہے دھڑکن ہے رقصِ تنہائی
شعلۂ جاں اور اس قدر تنہا

جل گیا تھا جو مرے چھونے سے
ہے بہشتوں میں وہ شجر تنہا

وہ گدا گر نہیں ہے سورج ہے
وہ جو پھرتا ہے دربدر تنہا

اس شکستہ دلی کے موسم میں
رہ گئے سارے ہم سفر تنہا

میرے سجدوں کے مٹ چکے ہیں نشاں
آج ہے اُس کا سنگِ در تنہا

موڑ بھی اس میں ہیں مگر تنویر
دور تک ہے یہ رہ گذر تنہا

۱۵ مئی ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

بزمِ جاں پھر نگہِ توبہ شکن مانگے ہے
لمس شعلے کا تو خوشبو کا بدن مانگے ہے

قد و گیسو کی شریعت کا وہ منکر بھی نہیں
اور پھر اپنے لیے دار و رسن مانگے ہے

رقصِ کاکل کے تصور کی یہ شیریں ساعت
شب کے پھولوں سے مہکتا ہوا من مانگے ہے

ٹوٹتے ہیں تو بکھر جاتے ہیں مٹی کے حروف
زندگی جن سے چراغوں کا چلن مانگے ہے

جس کو گھیرے ہوئے رہتے ہیں ہواؤں کے حصار
شمع جاں مجھ سے وہی دل کی لگن مانگے ہے

مسکراہٹ وہ کہ پھولوں پہ شکر برسا دے
ناز اس ریشمی ماتھے پہ شکن مانگے ہے

بھول افسانہ بھی افسوں بھی ہے لیکن تنویرؔ
چشمِ خوں بستہ نیا طرزِ سخن مانگے ہے

۲۵ مئی ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

حادثے وقت کے جو شیشۂ دل پر گذرے
کس سے کہیے وہ تری یاد میں کیوں کر گذرے

ٹوٹتا جاتا ہے موہوم عقائد کا طلسم
دل کی راہوں سے کوئی جیسے پیمبر گذرے

یہ تو اس شوخ کی عادت ہے اسے کیا کیجیے
نیچی نظروں میں چھپائے ہوئے خنجر گذرے

اب سرِ دار بھی جلتے نہیں زخموں کے چراغ
یوں تو آنکھوں سے کئی بار یہ منظر گذرے

میں تماشائی ہوں آیا ہوں چلا جاؤں گا
یہ ضروری تو نہیں حادثہ دل پر گذرے

تشنۂ افکار کو چھوتا ہوا یادوں کا طلسم
جیسے پہلو میں سرابوں کے سمندر گذرے

آبگینوں کی یہ بستی کہ جسے دل کہیے
اس سے تنویر کوئی گذرے تو کیوں کر گذرے

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

آبگینہ بھی جس کے پاس نہیں
کیسے کہیے کہ وہ اداس نہیں

اپنی اپنی صلیب کون اٹھائے
زندگی ورنہ کس کو راس نہیں

آبگینہ ہو، دل ہو، ساغر ہو
کوئی بھی شعلہ بے لباس نہیں

بت کدہ بھی ہے وقت کی تاریخ
کوئی بھی نقش بے اساس نہیں

ریزہ ریزہ ہوئی ہے دل کی چٹان
کوئی طوفاں بھی آس پاس نہیں

دل کی دھڑکن ہے زندگی کی غزل
حرفِ اندیشہ و قیاس نہیں

یہ مرے دل کے پھول ہیں تنویرؔ
بو نہیں جن میں کوئی باس نہیں

۳/۱۰/۹۱
دہلی

غزل

شکستہ بُت بھی مرے دل کی داستاں سا لگے
یہ بے زباں بھی مجھے اپنا ہم زباں سا لگے

بسی ہوئی ہیں جو اس میں رمیدہ خوشبوئیں
غبارِ راہ بھی پھولوں کا بادباں سا لگے

کبھی جو روشن و شفاف تھا یقین کی طرح
وہ فکر و فن کا تراشا بھی اب گماں سا لگے

کشاں کشاں مجھے لے آیا تیرا خواب اِدھر
یہ داغِ دل بھی چراغوں کا کارواں سا لگے

یہ کس سے کہیے کہ میرے ہی دل کا تذکرہ ہے
وہ نقشِ سنگ جو مٹتا ہوا نشاں سا لگے

غبارِ خاطرِ احباب اے معاذ اللہ
کہ آئینہ ہے یہ دل اور دھواں دھواں سا لگے

بدل گئے ہیں جو تنویرؔ دل کے پیمانے
کبھی جو سود تھا اب خود بھی وہ زیاں سا لگے

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء
دہلی

غزل

سُنا کیے، جسے افسانہ و خبر کی طرح
وہ آج ہونٹوں پہ ہے آہِ بے اثر کی طرح

میرے وجود کا ہمزاد میرا سایہ ہے
میری صلیب بھی ہے میرے ہم سفر کی طرح

پگھلتی جاتی ہے دل میں وہ برف کی چٹان
میں جس کو چھو نہ سکا دستِ بے ہنر کی طرح

چراغ نقشِ کفِ پا نہیں نہیں نہ سہی
نشانِ سجدہ تو ہو کوئی سنگِ در کی طرح

یہاں بھی ٹوٹتے رشتوں کا جیسے موسم ہے
الگ الگ ہیں سبھی وہ بھی ایک گھر کی طرح

گناہِ آدم و حوا کی بات کیا کیجیے
یہاں تو فکر بھی ممنوع ہے شجر کی طرح

یہ بجلیاں بھی نشیمن کے پھول ہیں تنویر
قفس بھی رقص میں ہے رقصِ بال و پر کی طرح

۴ جنوری ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

دل ہے اور رقصِ سلاسل تو اسے کیا کیجیے
لمسِ خوشبو بھی ہے قاتل تو اسے کیا کیجیے

آتشِ گل سے قفسِ شعلہ بداماں ہے مگر
اس پہ ہے رقصِ عنادل تو اسے کیا کیجیے

رنگ و بو ہیں جو زمانے کی ہواؤں کے لیے
دل کے پھولوں میں ہو شامل تو اسے کیا کیجیے

دل جو ریشم کی گرہ ہے وہ کھلا بھی کیوں کر
ذہن ہو عقدۂ مشکل تو اسے کیا کیجیے

مرے سجدے تو دھڑکتے نہیں اس دل کی طرح
پھر بھی ہو وہ تری محفل تو اسے کیا کیجیے

نقشِ پا بنتے گئے دل کے چراغوں کی قطار
دور ہوتی گئی منزل تو اسے کیا کیجیے

زندگی آگ کے دریا کا سفر ہے تنویر
اب سفینہ ہو نہ ساحل تو اسے کیا کیجیے

۱۴ فروری ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

ریشمی رات کی خوشبو کے سہارے چلیے
ساتھ آجائیں گے خود چاند ستارے چلیے

دل کی دھڑکن نہ سنی ہے نہ سنے گا کوئی
بے صدا شہر میں اب کون پکارے چلیے

دور تا دور ہے لہروں میں شفق کی سرخی
ڈوبے جاتے ہیں نگاہوں میں کنارے چلیے

چاند سورج نہیں آنسو تو گرے گا کوئی
ان خلاؤں میں بھی دامن کو پسارے چلیے

موج در موج ہے یہ دشت یہ صحرا یہ سراب
یوں بھی چلنا ہو تو کانٹوں کے سہارے چلیے

ایک قطرہ ہے لہو کا وہ جسے دل کہیے
کس نے پھولوں پہ یہاں نقش ابھارے چلیے

ہر زمانے کا مقدر ہے بدلنا تنویر
اب بھی یادوں میں ہیں باقی وہ نظارے چلیے

۱۴ / فروری ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

یہ کس سے کہیے کہ خوابوں کے ساتھ گزری ہے
یہ زندگی جو کتابوں کے ساتھ گزری ہے

نظر نے اس کو چھوا بھی تو فاصلے رکھ کر
وہ موجِ گل جو حجابوں کے ساتھ گزری ہے

یہ حوصلہ بھی کہاں آئنہ وہ دیکھ سکیں
وہ جن کی عمر نقابوں کے ساتھ گزری ہے

نفس نفس میں جلے بجھ کے آنسوؤں کے چراغ
یہ رات جیسے شہابوں کے ساتھ گزری ہے

یہاں تو دار و رسن ساتھ تھے چراغوں کے
یہ راہ کتنے عذابوں کے ساتھ گزری ہے

کبھی نہ ٹوٹ سکا دل کے آبلوں کا طلسم
حیات یوں تو خرابوں کے ساتھ گزری ہے

لہو کے پھول تو صحرا میں کھل گئے تنویر
یہی تو ہے کہ سرابوں کے ساتھ گزری ہے

۲۵ فروری ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

بن کے سایہ ہی اب جیا جائے
دھوپ کا گھونٹ ہی پیا جائے

رگِ جاں جل بجھے تو اب کیسے
دامنِ برق کو سیا جائے

قصہ در قصہ ہے فسانۂ دل
اس کو عنوان کیا دیا جائے

زندگی ہو صلیب ہو کہ چراغ
اب کسے چھوڑ کر جیا جائے

ذہن کو سنگ سار ہونا تھا
نام کس کس کا اب لیا جائے

یہ نہ ہو وہ نہ ہو تو پھر کیا ہو
کیا کہا جائے کیا کیا جائے

زندگی ہو تو جی بھی لیں تنویر
موت کو کس طرح جیا جائے

۴ مارچ ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

کششِ سنگِ در کو کیا کیجے
اعتبارِ نظر کو کیا کیجے

دل تو دل ہے دھڑکتا رہتا ہے
حرفِ نامعتبر کو کیا کیجے

دور تک سائے ہیں صلیبوں کے
روشنی کے سفر کو کیا کیجے

اشک پلکوں پہ آ کے ٹوٹ گئے
سعیِ عرضِ ہنر کو کیا کیجے

شہرِ ممنوع ہے وہ پیکرِ ناز
شعلۂ بے شجر کو کیا کیجے

موم کے بُت ہیں دستِ آذر میں
دل میں رقصِ شرر کو کیا کیجے

یوں تو پتھر بھی پھول ہیں تنویرؔ
شیشۂ شیشہ گر کو کیا کیجے

۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

انا کی قید سے باہر نکال دے مجھ کو
میں آبگینہ ہوں، پتھر میں ڈھال دے مجھ کو

وہ جن کو اپنی ہی بے چہرگی کا عکس کہوں
میں آئینہ ہی سہی خدّ وخال دے مجھ کو

دل و نگاہ تو ہیں دھوپ چھاؤں کا پیکر
تو بے مثال ہے اپنی مثال دے مجھ کو

میں دائرہ ہوں سمٹتا گیا ہوں نقطے میں
تو خود عروج ہے اپنا زوال دے مجھ کو

جواب جو بھی ہو میں خالی ہاتھ لوٹوں گا
تو بے نیاز ہے دستِ سوال دے مجھ کو

ازل سے تا بہ ابد تو ہے اور کچھ بھی نہیں
تو بے مآل ہے اپنا مآل دے مجھ کو

میرا وجود عدم کی شناخت ہے تنویرؔ
خلا خلا ہے تو اس میں اُچھال دے مجھ کو

۱۴ مئی ۱۹۹۲ء دہلی

غزل

ہم نفس، ہم صدا مِلا نہ مِلا
اب کوئی آشنا مِلا نہ مِلا
دل کی خوشبو چُرائے گا اب کون
لمسِ دستِ صبا مِلا نہ مِلا
دور تک ہیں نشاں صلیبوں کے
اب کوئی آسرا مِلا نہ مِلا
دل دھڑکتا رہا نفس بہ نفس
کوئی حرفِ دُعا مِلا نہ مِلا
خونِ دل ہم تو نذر کرتے رہے
کوئی اُس کا صِلا مِلا نہ مِلا
ہم تھے نقشِ سوال کیا کرتے
کوئی بھی، مُدّعا مِلا نہ مِلا
زندگی تھی گذر گئی تنویرؔ
اب کوئی ہم نوا مِلا نہ مِلا

۲۷ مئی ۱۹۹۲ء
دہلی

غزل

مل بھی جاتا، جو کہیں اب بقا کیا کرتے
زندگی، خود بھی تھی، جینے کی سزا کیا کرتے

سرحدیں وہ نہ سہی ہاں اپنی حدوں سے باہر،
جو بھی ممکن تھا کیا اُس کے سوا کیا کرتے

ہم سرابوں میں سدا پھول کھلاتے گزرے
یہ بھی تھا آبلہ پائی کا صلہ کیا کرتے

جس کو موہوم لکیروں کا مرقع کہیے
لوحِ دل پر تھا یہی نقشِ وفا کیا کرتے

اب وہ شعلوں کا نفس ہو کہ لہو کی خوشبو
دل پہ لہراتی رہی برقِ ادا کیا کرتے

مانگنے کو تو یہاں اپنے سوا کچھ بھی نہ تھا
لب پہ آتا بھی اگر حرفِ دعا کیا کرتے

ہم کو خود عرضِ تمنا کا سلیقہ بھی نہ تھا
وہ بھی تنویرؔ بھلا عذرِ جفا کیا کرتے

۱۲ جولائی ۱۹۹۲ء

غزل

جو سانس لے، وہ رہے درد مند، کیا کیجے
یہی ستم ہے، جو سب کی پسند، کیا کیجے

لبوں پہ کچھ نہیں دیوار قہقہہ کے سوا
دلوں پہ پھینک کے دیکھیں کمند، کیا کیجے

جو آشیاں ہے وہی تو قفس بھی ہے اپنا
دل و نظر کے ہوں جب در ہی بند، کیا کیجے

نظر بھی آئیں، بھلا کس کو زخم روحوں کے
زمانے بھر پہ یہاں زہر خند، کیا کیجے

چراغِ نقشِ کفِ پا ہیں، بجھتے جاتے ہیں
کرے ہوا کو یہاں کون بند، کیا کیجے

حصارِ جاں بھی اسے کیسے راس آئے گا
یہ شہرِ سنگ ہے، شیشوں میں بند، کیا کیجے

قدم قدم پہ یہاں ہفت خواں ہیں اے تنویر
کوئی لگائے کہاں تک زقند، کیا کیجے

۱۴/۱/۹۳
دہلی

غزل

ہر سفر، ایک مرحلہ بھی تو ہے
ہر قدم ایک فاصلہ بھی تو ہے

سنگ در سنگ ہے یہ شہرِ وجود
ہر نفس شیشۂ انا بھی تو ہے

دل کی دھڑکن کے راگ میں شامل
رقصِ زنجیر کی صدا بھی تو ہے

کہیے جس کو سفر چراغوں کا
میری یادوں کا سلسلہ بھی تو ہے

دل یہ شیشے کا بُتکدہ ہی سہی
پتھروں سے معاملہ بھی تو ہے

خونِ دل ہے یہ رائیگاں ہی سہی
میرے قاتل کا رہنما بھی تو ہے

حادثہ ہی سہی مگر تنویر
زندگی طُرفہ ماجرا بھی تو ہے

۱۳/۲/۹۲
دہلی

غزل

یہ بات دشتِ وفا کی نہیں، چمن کی ہے
چمن کی بات بھی، زخموں کے پیرہن کی ہے

ہوائے شہر بہت اجنبی سہی لیکن
یہ اس میں بُوئے وفا تیری انجمن کی ہے

میں بُت تراش ہوں پتّھر سے کام ہے مجھکو
مگر یہ طرزِ ادا تیرے بانکپن کی ہے

لپک تو شعلہ کی فطرت ہے پھر بھی کیا کیجئے
کہ اس میں پھول سی رنگت ترے بدن کی ہے

یہ میری وادیٔ جاں ناگ پھن کا جنگل ہے
یہ خوشبوؤں کی ردا شاخِ یاسمن کی ہے

مرے جنوں کی سزا سنگ سار ہونا ہے
لہو لہو یہ قبا، کیوں نگارِ فن کی ہے

یہ دل تو شعلۂ افسردہ ہے مگر تنویر
مری رگوں میں تپش گرمیٔ سخن کی ہے

۱۴/۲/۹۴
دہلی

غزل

شیشہ و شبنم و شہاب کی بات
وہ بھی جیسے حسین خواب کی بات

طُرفہ خوشبو ہے، خود وہ پیکرِ ناز
جیسے ہو صندل و گلاب کی بات

حُسن در حُسن ہے یہ ذکرِ جمیل
مُسکراتے ہوئے نقاب کی بات

پھول کی پتیوں میں بکھری ہے
شعر کی، شمع کی، شراب کی بات

آرزوؤں کی ہے "الف لیلیٰ"
زلفِ شبگوں کے پیچ و تاب کی بات

اب یہ کس کو یقین آئیگا
پھول کے لب پہ ہے سراب کی بات

دل کے سادہ ورق پہ لکھی ہے
وہ جو تنویر ہے کتاب کی بات

۱۷/۲/۹۳
دہلی

غزل

وہ نازِ حُسنِ مجسّم جسے کہا جائے
وہ رُوپ پھولوں کا موسم جسے کہا جائے

قیامتیں، وہ دل و جاں کے آبگینوں میں
کہ نقشِ نازِ دو عالم جسے کہا جائے

لبوں پہ نیم شگفتہ کلی تبسّم کی
وہ زخمِ روح کا مرہم، جسے کہا جائے

وہ رنگ و بو کے فرشتوں کا راز دار بھی ہے
دھنک کے پھولوں کا محرم جسے کہا جائے

وہ فتنہ فتنۂ خیالوں کا آرزو نامہ
وہ رقص کاکُلِ برہم، جسے کہا جائے

وہ داغِ عشق و وفا سے مہکتا رہتا ہے
وہ دل کہ شیشۂ شبنم جسے کہا جائے

یہ کس سے کہیے کہ تنویر نشترِ جاں ہے
وہ لمسِ ناز کہ ریشم جسے کہا جائے

دہلی
۷/۴/۹۴

غزل

دھوپ ہی دھوپ ہے پلکوں کی پناہوں کے سوا
اور پناہیں بھی کہاں پھول سی باہوں کے سوا

آئینہ بھی ہے یہاں حُسن دو عالم کا امین
یہ قیامت بھی ہے معصوم نگاہوں کے سوا

یہ الگ بات ہے، ہم اپنا پتہ بھول گئے
خود کو ڈھونڈا بھی کہاں ہے تری راہوں کے سوا

دل کے شیشہ پہ ہے پتھر کی لکیروں کا گماں
یہ بھی فنکاروں کی تاریخ ہے شاہوں کے سوا

ہے عجب سلسلۂ عشق و وفا کیا کیجئے
تار در تار ہیں نغمے بھی کراہوں کے سوا

آہ یہ لمس جنوں خیز یہ احساسِ وجود
کوئی تعبیر تو ہو اس کی گناہوں کے سوا

اس کے پیکر کی کہانی بھی عجب ہے تنویرؔ
دل کا پتھر بھی ہے وہ شیشہ کی باہوں کے سوا

۱۴/۴/۹۳
دہلی

غزل

نظر فریب نظاروں کا اعتبار آئے
سراب دل میں بکھر جائیں اور بہار آئے

یہ شہرِ جاں بھی ہے، بے جان پتھروں کا نگر
کہاں کہاں تجھے اے زندگی پکار آئے

کسی کی راہِ طلب کا، وہ اب نشاں بھی نہیں
جو، ہم صلیب پہ نقشِ وفا سنوار آئے

یہ پُر فریب تخیل ہے پھر بھی کیا کیجیے
یہی خیال اگر دل میں بار بار آئے

ہمیں نے رشتۂ جاں سے دلوں کے چاک سئے
ہمیں لیے ہوئے دامن کا تار تار آئے

ہزار شعلوں کی زد میں ہو جیسے موم کا شہر
یہ ہم ہی تھے کہ وہاں زندگی گذار آئے

نظر نظر میں تھی خوابوں کی وادیاں تنویر
قدم قدم پہ اُجالوں کے آبشار آئے

۱۵/۶/۹۳
دہلی

غزل

خواب تو خواب ہے، تعبیر بدل جاتی ہے
دل کے آئینہ میں تصویر بدل جاتی ہے

اب صلیبوں پہ کہاں گُل شدہ شمعوں کی قطار
اُن کی آن میں تحریر، بدل جاتی ہے

سر تو بدلے ہیں، نہ بدلیں گے، ہر وقت کے ساتھ
ظلم کے ہاتھ میں شمشیر، بدل جاتی ہے

روز بنتا ہے کوئی آگ کے تیروں کا ہدف
ریت پر خوں کی زنجیر، بدل جاتی ہے

دل کے پتھر کی لکیریں تو نہیں مٹ سکتیں
کششِ زلفِ گرہ گیر، بدل جاتی ہے

تنکا تنکا ہے قفس بھی تو نشیمن کی طرح
ہاں فقط حسرتِ تعمیر، بدل جاتی ہے

ان ہواؤں میں ہو دل کس کا نشانہ تنویر
جب بھی دیکھو روشِ تیر، بدل جاتی ہے

۱۴/۸/۹۲
دہلی

غزل

یہ شیشہ کاریٔ وہم و گماں عجیب سی ہے
دل و نگاہ کی یہ داستاں عجیب سی ہے

یہ دھڑکنیں کہ عبارت بھی ہیں اشارت بھی
یہ سحر کاریٔ لفظ و بیاں عجیب سی ہے

جو لکھی جاتی ہے دل پر نئی الف لیلے
یہ بوئے کاکلِ عنبر فشاں عجیب سی ہے

یہ پتیاں بھی ہیں یادیں حسین موسم کی
یہ گل فشانیٔ بادِ خزاں عجیب سی ہے

بکھر گئی ہے جو پھولوں پہ خوشبوؤں کی طرح
حسین ہونٹوں کی یہ کہکشاں عجیب سی ہے

یہ جیسے کرتی ہو رہ رہ کے شہرِ جاں کا طواف
ادا نمائیٔ برقِ تپاں عجیب سی ہے

یہ بت گری بھی تو اپنی تلاش ہے تنویر
یہ ہم زبانیٔ چشمِ بتاں عجیب سی ہے

۱۸/۵/۹۳
دہلی

غزل

گرہِ زلفِ دوتا کے کوئی معنی نہ رہے
دل کی زنجیرِ صدا کے کوئی معنی نہ رہے

اب کہاں عشقِ بلا خیز کا وہ رقصِ دوام
اب تو خود دشتِ بلا کے کوئی معنی نہ رہے

کس کو ٹوٹے ہوئے خوابوں کا مسیحا کہیے
جب کہ اندوہِ وفا کے کوئی معنی نہ رہے

درد کی لے ہے کہ فریاد میں ڈھلتی بھی نہیں
دل کی افسردہ فضا کے کوئی معنی نہ رہے

جب وہ دل ہی نہیں خوشبو کی گرہ کہیے جسے
شوخیِ دستِ صبا کے کوئی معنی نہ رہے

جس کے افسانوں سے بھی بوئے وفا آتی تھی
خود اسی شاخِ ادا کے کوئی معنی نہ رہے

ہم حدی خوانوں کی منزل ہی کہاں اے تنویر
اب تو اس بانگِ درا کے کوئی معنی نہ رہے

تکمیل
۶/۹/۹۳
دہلی

غزل

شیشہ در شیشہ ہے مے خانہ بہ مے خانہ ہے
حسن کی مے ہے کہ پیمانہ بہ پیمانہ ہے

شعلہ در شعلہ یہ پیکر، یہ صنم زارِ وجود
رقص در رقص ہے پروانہ بہ پروانہ ہے

آرزوئے دل ناکام یہ ہنگامۂ شوق
دشت در دشت ہے دیوانہ بہ دیوانہ ہے

اجنبی شہر کا منظر ہے کہ فانوسِ خیال
آئنہ، آئنہ بت خانہ بہ بت خانہ ہے

رات بھید دل بھری خوشبو کی الفِ لیلیٰ ہے
تارِ گیسو ہے کہ افسانہ در افسانہ ہے

حسن بے خواب بھی ہے چاند کی صورت تنہا
دل کی دھڑکن ہے جو کاشانہ بہ کاشانہ ہے

رنگ در رنگ ہے یادوں کی شفق اے تنویر
دل کی دنیا ہے کہ ویرانہ بہ ویرانہ ہے

۱۳/۹/۹۳
دہلی

غزل

بزمِ جاں کی تاب و تب کی بات تھی
وہ چراغِ نیم شب کی بات تھی

تارِ دامن کا صلہ ملتا بھی کیا
میرے دستِ بے طلب کی بات تھی

جس پہ ہم تنہا سزا پاتے رہے
کس سے اب کہیے وہ سب کی بات تھی

دل کے پتھر کی لکیریں مٹ گئیں
گم شدہ شہرِ طرب کی بات تھی

داغِ داماں بے لگی ہے جس پہ مہر
وہ مرے نام و نسب کی بات تھی

میکدہ اور یہ سرابوں کا جلوس
آرزوئے تشنہ لب کی بات تھی

دل کی دھڑکن جس پہ آ کر تھم گئی
جانے اے تنویرؔ کب کی بات تھی

غزل

حسیں خیال بھی، محوِ سفر ہیں کیا کیجے
یہ آئینے بھی فریبِ نظر ہیں کیا کیجے

ورق ورق یہ لکیریں ہیں دل کے افسانے
یہی تو سلسلہ ہائے خبر ہیں کیا کیجے

وہی مُسافرِ خونیں نوا چراغ بدست
اسی کے اشک تو عرضِ ہُنر ہیں کیا کیجے

یہی ہے وقت کے خواب و خیال کی تاریخ
یہ سنگ و خشت بھی شیشہ جگر ہیں کیا کیجے

یہی تو دل کے لیے ہے شکستِ عہدِ وفا
یہ آرزوئیں بھی لمسِ شجر ہیں کیا کیجے

نگاہِ شوق کے سجدے ہیں وہ بھی آوارہ
دلوں کے پھول یہاں سنگِ در ہیں کیا کیجے

دل و نظر کے یہ نادیدہ خواب ہیں تو نگر
کہ آبگینے بھی خود شیشہ گر ہیں کیا کیجے

۴/۲/۹۴
دہلی

غزل

دل کے پھولوں میں وفا کی خوشبو
جیسے ہونٹوں میں 'دُعا' کی خوشبو
مُسکراتی ہے، شفق کی صورت
آتشِ رنگِ حنا کی خوشبو
جیسے بکھری ہو ستاروں کی لڑی
اوس میں بھی ہے، صبا کی خوشبو
کاکُل شب کے حسیں حلقوں میں
کیا مہکتی ہے، بلا کی خوشبو
دل کو چھوتی رہی ریشم کی طرح
رات بھر زُلفِ رسا کی خوشبو
نیند آنکھوں سے چُرا لیتی ہے
چپکے چپکے یہ 'ہوا' کی خوشبو
دل کے بھیدوں کی طرح ہے تنویرؔ
گرہِ بندِ قبا کی خوشبو

بعد نظر ثانی
۲/۳/۹۴
دہلی

غزل

اک تماشا ہے خواب کی صورت
آئنہ ہے سراب کی صورت

جبکہ ہر نقش ہے سوال یہاں
بن پڑے کیا جواب کی صورت

جیسے جاری ہو روشنی کا سفر
نقش پا ہے شہاب کی صورت

اشک ہیں، نغمہ ریز، پلکوں پر
تار تارِ رباب کی، صورت

فتنہ انگیز ہے وہ نیم نگاہ
اس کے طرفِ نقاب کی صورت

خطِ تصویر میں لکھا ہو جسے
ذہن ہے اُس کتاب کی صورت

دل کا سادہ ورق بھی ہے تنویر
ورقِ انتخاب کی صورت

۸/۲
۹۴
دہلی

غزل

گرہِ زُلف کو تا بندِ قبا دیکھا ہے
اور آئینہ لیئے دستِ صبا دیکھا ہے

کس کی خاطر یہاں جلتا ہے کوئی کون ہے
شمعِ گریاں کو بداماں ہوا دیکھا ہے

برگِ گُل سے وہ تراشے ہوئے بُت ہوں جیسے
پتھروں میں بھی وہ افسونِ ادا دیکھا ہے

آنکھیں کرتی رہیں نا دور مسیحا کو تلاش
جب صلیبوں کو یہاں آبلہ پا دیکھا ہے

مُسکراتے بھی رہے خاک پہ گرتے بھی رہے
دل کے پھولوں کا دستورِ وفا دیکھا ہے

آبگینے بھی جہاں سنگِ حوادث تھے کبھی
نگہ ناز کا وہ دورِ جفا دیکھا ہے

دل کی دھڑکن جہاں رُک گئی آکر تنویر
چشمِ خاموش میں وہ جشنِ صدا دیکھا ہے

نظر شاہی

۴/۴/۹۴
دہلی

غزل

یہ موڑ ہوں کہ یہ رستے بدل تو سکتے ہیں
ہم اجنبی ہی سہی، ساتھ چل تو سکتے ہیں

یہ اشک کہیے جنھیں آرزو کے شمع و چراغ
لہو سے بھی مرے کچھ دیر جل تو سکتے ہیں

یہ انگلیاں ہیں کہ نشتروں کے نرغے ہیں
انھیں کے لمس سے چشمے ابل تو سکتے ہیں

جو پھول کھل گئے خود سے نظر کے صحرا میں
انھیں یہ ریت کے طوفاں نگل تو سکتے ہیں

یہ روز بڑھتے ہوئے شہر کے در و دیوار
شکستہ خوابوں کے ملبے میں ڈھل تو سکتے ہیں

یہ اور بات ہے منزل کے وہ نشاں نہ بنیں
چراغ دل کے اندھیروں میں جل تو سکتے ہیں

تم اپنے دام سے باہر نہ آ سکے تنویرؔ
نظر کے ساتھ نشانے بدل تو سکتے ہیں

نظر ثانی
۶/۶/۹۴
دہلی

غزل

وقت آتا ہے تو وہ بھی گرم موسم کی طرح
اور چھوتا ہے دلوں کو تارِ شبنم کی طرح

صبح کے آنچل میں وہ شفاف شیشوں کے گلاب
بوسہ گاہِ ناز ہیں، حسنِ دو عالم کی طرح

نشتروں کی آبداری اور ہوا کے لمس میں
بکھری جاتی ہے رگِ جاں وہ بھی ریشم کی طرح

حسیت کا زہر بن جاتی ہے پھولوں کی ہنسی
شمع کے آنسو بھی ہیں، شعلوں کے مرہم کی طرح

رات تھی، افسانہ وافسوں میں، دہراتی رہی
خوشبوؤں کی داستانیں، زلف برہم کی طرح

کہکشاں پلکوں پہ بکھری، بن گئی فانوس خواب
وہ بھی دل کی دھڑکنوں کے رقص پیہم کی طرح

ان گنت اوراق میں بھولی ہوئی تاریخ کے
ہم بھی اے تنویرؔ ہوں گے نقشِ مبہم کی طرح

نظر ثانی
۸/۶/۹۴
دہلی

غزل

دل کی دھڑکن میں کوئی کہانی بھی ہے
اس کی خوشبو ہی اس کی نشانی بھی ہے

وہ جو رشتوں کی زنجیر تھی کٹ گئی
اشکِ خوں ہی نہیں اب یہ پانی بھی ہے

یہ الگ بات ہے زہر در زہر ہو
شیشہ شیشہ مئے ارغوانی بھی ہے

خاکِ جاں میں نئے پھول کھلتے گئے
زندگی کا کوئی نقشِ ثانی بھی ہے

آج دشتِ وفا ہے ستاروں کا بن
آبلے میں تو گوہر فشانی بھی ہے

یوں تو خاموش ہیں یہ بھری بزم میں
ان چراغوں میں آتش بیانی بھی ہے

کہیے تنویرؔ جس کو بیاضِ نظر
وہ ورق در ورق گلفشانی بھی ہے

نظرِ ثانی
۶/۷/۹۴
دہلی

غزل

آبگینہ تھا دل کہ پتھر تھا
جو بھی تھا لخت لخت پیکر تھا

سُرخ پھولوں کی جس پہ مہریں تھیں
وہ مرے قتل ہی کا محضر تھا

اب شکستِ انا کا ذکر ہی کیا
میرے سجدوں کو ایک ہی در تھا

پھول تھے وقت کی صلیبوں پر
کوئی تاریخ ہی کا منظر تھا

ہاتھ تھے میرے شیشۂ ساعت
دور تک ریت کا سمندر تھا

شاخِ گل لے کے چل رہے تھے جو لوگ
آستینوں میں سب کی خنجر تھا

شیشہ رہنے کی بات کیا تنویر
دل کا آئنہ بھی مکدر تھا

نظرِ ثانی
۷/۷/۹۴
دہلی

غزل

ابھی تو آنکھوں میں نادیدہ خواب باقی ہیں
جو وقت لکھ نہیں پایا، وہ باب باقی ہیں

سزا جو اگلے صحیفوں میں تھی تمام ہوئی
مگر صحیفۂ دل کے عذاب باقی ہیں

کروگے جمع، بھلا کیسے، دل کے شیشوں کو
ابھی تو دستِ فلک میں، شہاب باقی ہیں

اُڑا کے لے گئی آندھی وہ حرف حرف کتاب
جو صفحہ صفحہ ہیں، دل کے سراب، باقی ہیں

جو گیلی ریت پہ، طوفاں بنے گزر بھی گئے
وہ بھیگی پلکوں میں اب تک سحاب باقی ہیں

وہی تو وقت کی بے چہرگی ہے اپنی شناخت
کہ جس پہ اب بھی ہزاروں نقاب باقی ہیں

لہو کے پھول خزاں آشنا نہیں تنویر،
کہ دشت دشت، شفق کے گلاب باقی ہیں

نظر ثانی
۱۹/۷/۹۴
دہلی

غزل

دل کے پھولوں کی خوشبو چُرا لی گئی
آرزو غم کے سانچوں میں ڈھالی گئی

چشمِ خوں بار کی وہ کہانی کہاں
وہ جو رسمِ وفا تھی اٹھا لی گئی

خواب تھے زندگی کے بکھرتے گئے
اب وہ خوشبوئے جام سفالی گئی

رات ہی، رات کے بعد آتی رہی"
صبح تھی وہ، جو واپس بُلا لی گئی"

خون کی سرخیاں تھیں سمٹتی گئیں"
مے نہیں مے کی رنگت بھی خالی گئی،

قتل گاہوں سے لا کے چراغوں کو ہم
ان سے پھر دل کی محفل سجالی گئی"

خاکِ جاں تھی جو تنویر کام آ گئی
شمع، مٹی کی اس سے بنا لی گئی"

نظرِ ثانی
۶/۷/۹۴ دہلی

غزل

حسین خواب تھا، جو رشتۂ گہر کی طرح
وہ لمحہ لمحہ بکھرتا رہا، سحر کی طرح

وہ فکر و فن نہیں خونِ جگر کا ورثہ تھا
میں جس کو چھو نہ سکا، دستِ بے ہنر کی طرح

ہزار تیروں کے ترکش تھے مثل سورج کے
مرے وجود میں پیوست، بال و پر کی طرح

جو پتھروں میں لکھی تھی مری کہانی تھی
وہ بوئے گل تھی کہ اڑتی رہی خبر کی طرح

وہ آرزو وہ نوا سینہ تاب کہئے جسے
رہی وہ رقص میں اور آہ بے اثر کی طرح

جلا وہ تارِ رگِ جاں بھی شمع کی صورت
جو زندگی میں رہا دستِ بے شجر کی طرح

چراغ بجھ گئے تنویرؔ دُور منزل سے
دھواں دھواں ہے افق نقشِ رہگذر کی طرح

نظرِ ثانی
۴/۴/۹۴
دہلی

غزل

قدم قدم پہ نگاہوں کے فاصلے بھی تو ہیں
جو پھول بن کے کھلے ہیں وہ آبلے بھی تو ہیں

وہ دھڑکنیں تو نہیں ہیں کہ ان کو سن لیجے
دلوں کے ساتھ دلوں کے معاملے بھی تو ہیں

نظر نظر میں بدلتے گئے ہیں پیمانے
خیال و خواب کے نادیدہ مرحلے بھی تو ہیں

یہ اور بات ہے دل میں سما گئے وہ بھی
ادا ادا میں قیامت کے زلزلے بھی تو ہیں

کہاں یہ کون کہے کس کی یاد آئے گی
کہ آرزوؤں کے گم گشتہ قافلے بھی تو ہیں

کہیں بھی جل نہ سکا کوئی نقشِ پا کا چراغ
انھیں سرابوں میں اشکوں کے سلسلے بھی تو ہیں

بھلا یہ کون کہے گا یہ کھیل ہے تنویرؔ
جہان و جاں میں یہی سب مقابلے بھی تو ہیں

۴/۸/۹۴

غزل

کل کو پھر آئیں گے ہم بادِ صبا کی صورت
دل کے آئینہ میں تصویر ادا کی صورت

وہ کوئی حُسنِ عقیدت ہی کا نغمہ ہوگا
جس کو دہرائیں گے، لبِ حمد و ثنا کی صورت

ریشمی پھول کی نازک سی گرہ ہو جیسے
ہو گی کل پھر بھی نئے بندِ قبا کی صورت

اُڑ کے آ جائیں گے پھر دل کے قفس کی جانب
طائرِ رنگ کی، خوشبوئے، حنا کی صورت

پھر سے پلکوں پہ دھنک بن کے جلے گا ساون
ہوگی آنکھوں میں کسی شمعِ وفا کی صورت

کل نئے دیر و حرم ہوں گے نئے شمع و چراغ
پھر بتوں میں نظر آئیگی خُدا کی صورت

جب بھی لہرائیں گی زلفوں کی گھٹائیں تنویرؔ
شاخِ گُل لہکیگی، پھر برقِ ادا کی صورت

۱۴/۸/۹۴
دہلی

غزل

آرزو رقصِ شرر کے تو منافی بھی نہیں"
جستجو ہے تو کوئی تجربہ کافی بھی نہیں

میں نے پلکوں کو اگر خونِ جگر سونپ دیا
زندگی سے، یہ عمل وعدہ خلافی بھی نہیں

پردہ در پردہ ہیں جو خواب ہیں ان آنکھوں میں
اس پہ وہ ریشمی آنکھیں جو غلافی بھی نہیں

لمس در لمس ہے کیسے جسے احساس وجود
جرم وہ جرم کوئی جس کی معافی بھی نہیں

ہم سر دشتِ وفا اپنا پتہ بھول گئے
مڑ کے دیکھو تو کو اس کی تلافی بھی نہیں

سانس لیتی ہیں، جو ہر سمت حسیں خوشبوئیں
ان کا کیا کیجیے یہ دل صوفی صافی بھی نہیں

ریت پر لکھتے ہو تنویر جنوں کی تاریخ
تم مورخ بھی نہیں کوئی صحافی بھی نہیں

نظر ثناتی
۱۶/۸/۹۴
دہلی

غزل

یادِ یارو محفلِ رندانہ بن جائیں گے ہم
کل کو شمعِ کشتۂ کاشانہ بن جائیں گے ہم
آج رقصِ شیشہ و پیمانہ کی تصویر ہیں
کل شکستِ شیشہ و پیمانہ بن جائیں گے ہم
آج ہم بھولی ہوئی تاریخ دہرانے کو ہیں
کل کو خود افسانہ در افسانہ بن جائیں گے ہم
آج ہیں سنگ درِ جانانہ پر ہم سجدہ ریز
کل کو خود سنگ درِ جانانہ بن جائیں گے ہم
آج ہیں شمع و چراغ محفلِ حرف و قلم،
کل کو خود خاکستر پروانہ بن جائیں گے ہم
آج ہم خاک رہِ میخانہ پر ہیں گل فشاں
کل کو خود خاک رہِ میخانہ بن جائیں گے ہم
آج اس ویرانۂ آباد میں ہیں گوشہ گر
کل تو اے تنویرؔ خود ویرانہ بن جائیں گے ہم

نظر ثانی
۱۸/۸/۹۴
دہلی

غزل

ہم آج کس سے غمِ آرزو کی بات کریں
نئی نظر کی نئی جستجو کی بات کریں

جو دل کے شیشہ کو بھی سنگسار ہوتا ہے
تو شہرِ سنگ میں جام و سبو کی بات کریں

جو لوگ پھولوں کی تاریخ ہی کو بھول گئے
اب ان سے کیا کششِ رنگ و بو کی بات کریں

یہاں فرار کی، جا ہو تو کیوں پناہ نہ لیں
شرار سے رقصِ لہو کی بات کریں

جو دل کے زہر سے بھی مے کشید کر نہ سکیں
وہ جام توڑ دیں ظرفِ وضو کی بات کریں

جو اپنی آبلہ پائی کی لکھ سکیں تاریخ
وہی تو دشت میں جوشِ نمو کی بات کریں

جو پتھروں کو زباں دے سکیں وہی تنویرؔ
حسیں لبوں کی حسیں گفتگو کی بات کریں

نظر ثانی
۲۴/۸/۹۴
دہلی

غزل

دل کی تحریر ہے بے ربط خیالوں کی طرح
محضر فکر ہے کچھ کہنہ قبالوں کی طرح

یہ الگ بات ہے اب کوئی ہمیں حل نہ کرے
ہم کہ موجود ہیں ذہنوں میں سوالوں کی طرح

آج کا لمحۂ انکار گزر جانے دو،
کل یہ دہرائیں گے ہم کو بھی مثالوں کی طرح،

یوں تو پڑھتا ہے بھلا کون کتابِ دل کو
پیش کرتے ہیں مگر لوگ حوالوں کی طرح

کوئی بھی نقل ہمیں کر کے بھلا کیا لیتا
ہم کہ فٹ پاتھ پہ بھی بکتے تھے رسالوں کی طرح

اب تو یہ دشتِ وفا دل کی طرح سونا ہے
غم کے سایے بھی ہیں رم خوردہ غزالوں کی طرح

کون مانوس ہے جذبہ کی زباں سے تنویرؔ
لوگ سن لیتے ہیں زنجیر کے نالوں کی طرح

بعد نظر ثانی

۲۶/۸/۹۴
دہلی

غزل

یہ گھٹا جو زلفِ عنبر بیز ہے
اس کی خوشبو کتنی دل آویز ہے

ہر نفس ہے جیسے صدیوں کا سفر
وقت کی رفتار کتنی تیز ہے

جیسے اڑتے ہوں ہواؤں میں حروف
گردشِ فانوس وحشت خیز ہے

ذہن کی سرشاریوں کا جشن ہے
شیشۂ دل ساغر گل ریز ہے

شہر جاں اور دل کی مٹی کا حصار
حادثوں کے واسطے مہمیز ہے

ویسے تو یہ اشک ہیں پانی کے پھول
قطرہ در قطرہ شفق آمیز ہے

شعر ہے تخمیر وہ پھولوں کی مے
جرعہ جرعہ جس کا زہر آمیز ہے

تکمیل و نظر ثانی
۲۶/۸/۹۴
دہلی

غزل

وہ آرزو، جسے شاخِ سمن کہا جائے
وہ زندگی، جسے دیوانہ پن کہا جائے

وہ تیری خلوتِ ناز و ادا ہے کیا کیجے،
وہ انجمن کہ جسے انجمن کہا جائے

وہ حرفِ دل کہ عبارت بھی ہے اشارت بھی
وہ آئنہ ہے 'جسے' ہم سخن کہا جائے

یہ زخم زخم لگا ہوں کا "جستجو نامہ"
یہ دشتِ جاں کہ جسے پھول بن کہا جائے

یہ خار خار حوادث یہ شعلہ شعلہ سفر
یہ خاکِ دل، جسے گل پیرہن کہا جائے

یہ کس سے کہیے کہ وہ بھی تو دل کا ریشم ہے
وہ سلسلہ جسے "دار و رسن" کہا جائے

چراغِ دشتِ وفا ہیں یہ آبلے تنویرؔ
وہ جن کو نقش گرِ فکر و فن کہا جائے

نظرثانی
۲۶/۸/۹۴
دہلی

غزل

پیشہ ور ہیں جو قاتل ہیں کیا کیجئے
اب وہی اہلِ محفل ہیں کیا کیجئے

جن کے ہاتھوں میں پتھر ہیں دل کی طرح
آئنوں کے مُقابل ہیں کیا کیجئے

دیر تک جس پہ جلتی رہیں کشتیاں
ہم وہی موجِ ساحل ہیں کیا کیجئے

وقت کی دھڑکنیں جس کی جھنکار ہیں
ہم وہ رقصِ سلاسل ہیں کیا کیجئے

جس کو تاریکیوں میں سجایا گیا
ہم وہی نقشِ منزل ہیں کیا کیجئے

شہر در شہر ہیں جو دھوئیں کے شجر
ہم انھیں کے مماثل ہیں کیا کیجئے

ہم ہیں تنویر اور جشنِ بیچارگی
اب اس کے تو قابل ہیں کیا کیجئے

۲۶/۸/۹۴

غزل

روایت لبِ اظہار توڑ دی میں نے
کہ مُہرِ دستِ قلمکار توڑ دی میں نے

یہ میرے ہاتھ ہیں اور بے شناخت اب بھی نہیں
یہ اور بات ہے تلوار توڑ دی میں نے

فصیل وقت کی دیوار قہقہہ تو نہ تھی
ہنسی ہنسی میں جو دیوار توڑ دی میں نے

جو باہر آ نہ سکی اپنے دائرے سے کبھی
ادارہ بند وہ پرکار توڑ دی میں نے

روایتوں نے جو صدیوں گلو میں باندھی تھی
وہی رسن تو سرِ دار توڑ دی میں نے

کہاں وہ حسن کشش اور کہاں یہ استحصال
کمندِ سُبحہ و زنّار توڑ دی میں نے

نظر نظر میں جو میزان قدر تھی تنویر
وہ رسمِ دیدۂ خونبار توڑ دی میں نے

نظر ثانی
۲۸/۸/۹۴
دہلی

غزل

چراغ دِل کہ شہابوں کا جو نشانہ بنے
وہ آئنہ کہ شکستوں کا جو فسانہ بنے
وہ بوئے گُل کہ بکھر جائے وادیٔ جاں میں
وہ گمرہی کہ تجسّس کا جو بہانہ بنے
وہ ظرفِ دل کو بنے صندل و گلاب کی راکھ
ہوائے شوق کہ خوشبو کا آشیانہ بنے
ورق ورق پہ لکھے دل کے جو الف لیلیٰ
جو لمسِ ناز ہو وہ حرفِ محرمانہ بنے
بکھر گئی ہوں جو پلکوں پہ ریشمی راتیں
اُنھیں کا ذکر چھڑے نغمۂ شبانہ بنے
وہ برگِ لب کہ مہکتا ہو دل کی خوشبو سے
وہ مُسکرائے تو انداز قاتلانہ بنے
غزل کہ یادوں کی رنگیں دھنک ہے اے تنویرؔ
اگر یہ دل میں چلے نقشِ دلبرانہ بنے

بعد نظرِ ثانی
۲۰/۸/۹۴
دہلی

غزل

دلِ بے داغ بے نشاں بھی تو ہے
شمعِ بے شعلہ، بے زباں بھی تو ہے

ریگِ صحرا کی جو کہانی ہے
وہ سمندر کی داستاں بھی تو ہے

بجلیوں کے، حروف ہیں، منقوش
میری، رودادِ آشیاں بھی تو ہے

دُور تک، یہ لڑی چراغوں کی
میری پلکوں کی کہکشاں بھی تو ہے

آتشِ کارواں کا، سرخ دھواں
قافلہ قافلہ، رواں بھی تو ہے

وہ جو پتھر تراشنے میں کٹی
اب وہی عمر رائیگاں بھی تو ہے

دھوپ چھاؤں کا یہ سفر تنویر
جو یقیں ہے، وہی گماں بھی تو ہے

نظرِ ثانی
۲۸/۸/۹۴
دہلی

غزل

منزل ملے، ملے نہ ملے راستہ ملے
اس دشتِ آرزو میں کوئی نقشِ پا ملے

جب سوچ بھی بدل گئی لفظوں کے ساتھ ساتھ
ممکن نہ تھا کہ اپنا کوئی ہمنوا ملے

یہ اور بات ہے وہ چراغِ وفا نہ ہو
شعلہ ہی کوئی اب مرے قدموں سے آ ملے

یہ قربتیں اور ان پہ یہ سنگین دوریاں
شاید ہی اس سے بڑھ کے کوئی فاصلہ ملے

ہم خود کو چھوڑ کر تو بہت دور آ گئے
اب تو نہیں تو کون ترا ہم ادا ملے

اپنوں میں "ہم صلیب" جو بنتا وہ کون تھا
یوں کشتۂ ستم تو سبھی بے خطا ملے

تنویرؔ ہم بدل نہ سکے زندگی کے ساتھ
اب یہ فضول بات ہے "سب بے وفا ملے"

نظرِ ثانی
۶/۹/۹۴
دہلی

غزل

آگ تو آگ سے نہ بجھ پائی،
بڑھ گئی زخمِ جاں کی رسوائی
شعلہ شعلہ خیال کا فانوس
دل ہے اور درد ناشکیبائی
ذہن کا آئینہ تھا گرد آلود
خود سے بھی کب ہوئی شناسائی
گل فشاں وقت کے دریچے ہیں
چل رہی ہے ادا سے پروائی
وہ معمّے حروف کیسے جنھیں،
اپنے معنی کے ہیں تمنّائی،
آئنہ آئنہ نقوشِ جمیل"
دیدہ و دل کی ہیں، خود آرائی
ایک حسنِ فریب ہے تنویرؔ
یادِ رفتہ کی، یہ دل آسائی

۹/۹/۹۴ دہلی

غزل

شتِ جاں کے ساتھ ہے صحرا کی تنہائی کا بوجھ
آبلہ پائی ہے اور زنجیر رسوائی کا بوجھ

آئنہ تھا وہ کہ چپکے سے مقابل آگیا
حُسن بھی کب تک اٹھاتا اپنی یکتائی کا بوجھ

پتھروں کے قافلے ان موسموں کے ساتھ تھے
دل پہ ہم سہتے رہے جن کی پزیرائی کا بوجھ

اس کو تو گھیرے رہے معصوم پروانوں کے خواب
شمع محفل نے اٹھایا کب یہ تنہائی کا بوجھ

آخرش دل میں سمٹ آئے نگاہوں کے سراب
کس سے اٹھتا ہے سمندر کی سی پہنائی کا بوجھ

آب گینوں کی یہ بستی اس پہ مٹی کا حصار
شیشۂ احساس اور پتھر سی دانائی کا بوجھ

درد کے رشتے تھے کل تنویرؔ زنجیرِ وفا
آج ہیں یہ روح پر زخموں کی یکجائی کا بوجھ

نظرثانی تیسری بار
۹/۹/۹۴ دہلی

غزل

کون سمجھے گا، بھلا اُس نگہِ ناز کی بات
یوں وہ کہنے کو نہیں، سحر کی، اعجاز کی بات

دل کی دھڑکن ہے کہ خوشبو میں بدل جاتی ہے
جیسے چھپتی ہی نہیں، اس سے کوئی راز کی بات

یں بھی افسانہ در افسانہ ہے ہر بات یہاں
کوئی انجام کی صورت ہے، نہ آغاز کی بات

حلقہ در حلقہ ہیں، خود میری اُمیدوں کے سراب
کون، زنجیر سے کرتا ہے، تگ و تاز کی بات

آئنہ دیدہ، حیراں ہے مگر دل تو نہیں،
اب وہ پائے بھی کہاں غمزۂ غماز کی بات

وادیٔ جاں میں بکھر جاتی ہے نغموں کی طرح
تیرے لہجہ کی کھنک، نقرئی آواز کی بات

زندگی بنتی ہے یادوں کی کہانی تنویر،
رات جب کہتی ہے اس جلوہ گہِ ناز کی بات

بعد نظر ثانی
۹/۹/۹۴
دہلی

غزل

یہ وقت کہ آگ کا دریا ہے اور ساحل ساحل طوفاں ہے
یہ کشتی موم کی کشتی ہے اور یہ دل سوختہ ساماں ہے

اپنے ہی زخمی ہاتھوں سے زخموں کے چاک لیے ہم نے
جو آج ہے اپنے ہاتھوں میں اپنا ہی تارِ گریباں ہے

اپنے ہی وطن میں، بے وطنی کا ہوتا ہے احساس بہت
جان نہیں پہچان نہیں جو ہے ناخواندہ مہماں ہے

اپنے اپنے جرموں کی پاداش ہے اپنی اپنی سزا
جس میں ہم سب ساتھ رہے ہیں اب وہ گھر بھی زنداں ہے

کس سے اب ہے درد کا رشتہ کون دلوں کا محرم ہے
جس سے ہم کو ہے یہ توقع وہ بھی آج کا انساں ہے

خون کے رشتے ہے بھی کہاں جب درد کے رشتے ٹوٹ چکے
گھر آنگن میں شور بپا ہے جو ہے خاک بداماں ہے

وہ پھولوں کے ساز تھے جن کو توڑ دیا تم نے تنویر
دھڑکن دھڑکن سن کر دیکھو اب بھی کون غزل خواں ہے

بعد نظر ثانی
۱۰/۹/۹۴
دہلی

غزل

اب نہ وہ سر ہے نہ آشفتہ سری
دل کا وہ شیشہ نہ وہ شیشہ گری
نہ وہ آوارہ خرامی نہ جنوں
نہ ہواؤں کی طرح در بدری
اب نہ وہ کاہ نہ وہ کاہ رُبا
اب نہ وہ خواب نہ وہ بے خبری
میری مٹھی میں ہو تو سورج بھی تو کیا
میری تقدیر تو ہے کم نظری
اب وہ کردار کہاں سے آئیں
دل کا قصہ ہے نہ وہ دیو و پری
دل کے پھولوں کی، نہ خوشبو کی شناخت
آ گئی کام مری بے ہنری
سانس لینا بھی ہے مشکل تنویر
یوں تو وہ شیشہ نہ وہ شیشہ گری

نظرِ ثانی
۱۰/۹/۹۴

غزل

فشارِ حسن سے آغوشِ تنگ مہکے ہے
صبا کے لمس سے پھولوں کا رنگ مہکے ہے

ادائے نیم نگاہی بھی کیا قیامت ہے
کہ بن کے پھول وہ زخمِ خدنگ مہکے ہے

یہ وحشتیں بھی مری خوشبوؤں کا حصہ ہیں
کہ مرے خون سے دامانِ سنگ مہکے ہے

ادائے ناز بھی ہے حسن و اہتزاز کی بات
کہ تارِ زلف نہیں، انگ انگ مہکے ہے

لہو کے پھولوں سے آراستہ ہے تیغِ ستم
شفق شفق جو یہ مقتل کا رنگ مہکے ہے

چراغِ لالہ سے روشن ہوا ہے دشت وفا
ہوائے دل سے یہ نقشِ فرنگ مہکے ہے

شکر لبوں کے تبسم کی بات کیا تنویرؔ
نفس نفس میں مئے لالہ رنگ مہکے ہے

نظر ثانی
۱/۹/۹۴
دہلی

غزل

سنگ سے شیشہ و ساغر کو تراشا میں نے
اپنی تقدیر کے منظر کو تراشا میں نے

آج قدروں کی بھی دریوزہ گری کس سے کریں
دل کی مٹی ہی سے گوہر کو تراشا میں نے

کتنے منظر ہیں کہ فرسودگیٔ فکر بھی ہیں
ٹوٹتے خوابوں کے پیکر کو تراشا میں نے

دل بھی شیشے کا قفس تھا نئے سورج کی طرح
جب اجالوں کے لیے در کو تراشا میں نے

میں تو چٹان تھا تاریخ کی بے حس چٹان
اپنے اندر ہی سے آذر کو تراشا میں نے

میرا سرمایہ تھا وہ فصلِ خزاں کہیے جسے
زرد پھولوں ہی سے خود زر کو تراشا میں نے

داغ تو داغ نہیں، رقصِ شرر تھا تنویرؔ
جس سے خوشبوئے گلِ تر کو تراشا میں نے

نظر ثانی
۱/۹/۹۴ دہلی

غزل

اپنی ادا پہ ہم ہی ہوئے خوار بھی بہت
ہم کو رہا جنوں سے سروکار بھی بہت

منصور کو ہے تختِ گہِ دار کی طلب
ہم دل جلوں کو سایۂ دیوار بھی بہت

یہ ذہن دائروں میں رہا قید عمر بھر
دل کے لیے ہے گردشِ پرکار بھی بہت

چہرہ ہو، بے شناخت تو آئینہ کیا کرے
یوں عکس کو ہے صورتِ زنگار بھی بہت

اس حسیت کے ساتھ میں جیا بھی کس طرح
دل کو ہے زندہ رہنے کا آزار بھی بہت

وہ کون ہو جو میرے غموں کا شریک ہو
مجھ کو تو ہے تصورِ غم خوار بھی بہت

خونریز زندگی کا مقدر تھی یہ صلیب
کہنے کو تھے چراغ، سرِ دار بھی بہت

۱۰/۹/۹۴

غزل

دل کے پھولوں کے قافلے ہیں یہ حرف،
آب گینوں کے سلسلے ہیں یہ حرف
گم شدہ شہرِ جستجو کے نشان،
دیدہ و دل کے فاصلے ہیں یہ حرف
بجھ گئے جب دل و نظر کے چراغ
ایسے ہر موڑ پر جلے ہیں یہ حرف
اشک تھے ڈھل گئے سرابوں میں
پھولوں کے زہر سے گلے ہیں یہ حرف
ان کے معنی نہیں کتابوں میں
دل کے نازک معاملے ہیں یہ حرف
ان کا شہرِ صدا سے رشتہ ہے
پتھروں میں کہیں پلے ہیں یہ حرف
طفلِ نادان ہے وہ دل اب تک
جس کے تنویرؔ، مشغلے ہیں یہ حرف

نظرِ ثانی

۱۱/۹/۹۴
دہلی

غزل

دل کے بھولے ہوئے افسانے بہت یاد آئے
زندگی تیرے صنم خانے، بہت یاد آئے

کوزۂ دل کی طرح پہلے انھیں توڑ دیا
اب وہ ٹوٹے پیمانے بہت یاد آئے

وہ جو غیروں کی صلیبوں کو اٹھا لائے
خود مسیحا کو وہ دیوانے بہت یاد آئے

جسم و جاں کے یہ صنم زار الٰہی توبہ،
دل کے اجڑے ہوئے بت خانے بہت یاد آئے

موت کا رقص ہے افسردگی جاں کا علاج
جل بجھی شمع تو پروانے بہت یاد آئے

دل کے زخموں کے بھلا کس کو میسّر ہیں چراغ
اشک در اشک وہ نذرانے بہت یاد آئے

دیکھ کر شہر خرد کی یہ کشا کش تنویر
دشتِ احساس کے ویرانے بہت یاد آئے

نظر ثانی
۱۳/۹/۹۴
دہلی

غزل

جو محفلِ محملِ رقصاں ہیں وہ پھول نہیں پیمانے ہیں
جو دل کی طرح ہیں گردش میں، وہ جام نہیں میخانے ہیں

اب کون کہے اور کون سنے دل ہے کہ دھڑکتا رہتا ہے
آنکھوں سے جو لب تک آ پہنچے وہ شعر نہیں افسانے ہیں

اس شہرِ خرد میں کیا کیجے جو نقش ہے بکھرا بکھرا ہے
فرزانے چاک بداماں ہیں ہم لوگ تو پھر دیوانے ہیں

پت جھڑ کا ساز کہیں جس کو ریشم ہے پیلے پھولوں کا
جو آنکھیں شبنم شبنم ہیں وہ خوابوں کے ویرانے ہیں

پتھر کے ورق ہیں دل بھی یہاں تحریر ہے ان پر پھولوں کی
مٹی کے بتوں کی پوجا ہے اور خوشبو کے نذرانے ہیں

وہ عکس ہو یا خود آئینہ سب ہی تو اضافی قدریں ہیں
تخئیل کے نازک رشتے ہیں تمثیل کے تانے بانے ہیں

لفظوں کی پرتیں ہٹتی ہیں تب کھلتی ہے جذبوں کی دھنک
تنویرؔ یہ بکھرے حرفوں کے احساس کے زنداں خانے ہیں

نظر ثانی
۱۴/۹/۹۴
دہلی

غزل

خود کو مانوسِ جفا کرتے رہے
یوں بھی کم اپنی سزا کرتے رہے

ہم تھے، مجبوریٔ حالات کے ساتھ
عہدِ تسلیم و رضا کرتے رہے

پتھروں پر ہی بہ ایمائے خلوص
سجدۂ شکر ادا کرتے رہے

زہر کو بھی تو دوا کہنا تھا
حق میں قاتل کے دعا کرتے رہے

اعتبار اس کو وفا پر بھی نہ تھا
جس سے ہم عہدِ وفا کرتے رہے

ہم خلاؤں میں رہے گرمِ سفر
دل سرابوں پہ فدا کرتے رہے

نذر کرنے تھے جو تنویرؔ چراغ
در بدر پھرتے صدا کرتے رہے

نظرِ ثانی
۱۵/۹/۹۴
دہلی

غزل

لمحہ در لمحہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے
وقت خوشبو ہے بکھرتا ہی چلا جاتا ہے

آب گینوں کا شجر ہے کہ یہ احساس وجود
جب بکھرتا ہے بکھرتا ہی چلا جاتا ہے

دل کا یہ شہر صدا اور یہ حسیں سناٹا
وادیٔ جاں میں اترتا ہی چلا جاتا ہے

اب یہ اشکوں کے مرقعے ہیں کہ سمجھے ہی نہیں
نقش پتھر پہ سنورتا ہی چلا جاتا ہے

خون کا رنگ ہے اس پہ بھی شفق کی صورت
خاک در خاک نکھرتا ہی چلا جاتا ہے

واپسی کا یہ سفر کب سے ہوا تھا آغاز
نقش پا جس کا ابھرتا ہی چلا جاتا ہے

جیسے تنویرؔ کے ہونٹوں پہ لکھی ہے تاریخ
ذکر کرتا ہے تو کرتا ہی چلا جاتا ہے

۱۵/۹/۹۴
دہلی

غزل

کمندِ حلقۂ گفتار توڑ دی میں نے
کہ مہرِ دستِ قلمکار توڑ دی میں نے
روایتوں کو صلیبوں سے کر دیا آزاد
یہی رسن تو سرِ دار توڑ دی میں نے
یہ میرے ہاتھ ہیں اور یہ شناخت اب بھی نہیں
یہ اور بات ہے تلوار توڑ دی میں نے
سفینے ہی کو میں شعلہ دکھا کے نکلا تھا
جو اپنے ہاتھ سے پتوار توڑ دی میں نے
تحکمانہ ادا اور فیصلے دل کے
کمانِ ابروئے خمدار توڑ دی میں نے
گرہ گرہ جو کہیں اور رشتہ رشتہ کہیں
یہ رسمِ سُبحہ و زنار توڑ دی میں نے
وہ دائروں سے جو باہر نہ آسکے تنویرؔ
وہ رسمِ گردشِ پرکار توڑ دی میں نے

۱۵/۹/۹۴
دہلی

غزل

دل کے ریشم کا سازؔ اے توبہ
رقصِ گلہائے نازؔ اے توبہ
آب گینوں میں جیسے آگ جلے
شیشۂ شیشۂ گداز اے توبہ
جیسے ہونٹوں پہ کھل رہے ہوں گلاب
نغمۂ نے نواز' اے توبہ
جیسے پھولوں کو نیند آجائے
حُسن اور خوابِ ناز اے توبہ
جیسے سرگوشیاں ہوں شعلوں کی
محرمِ حرفِ راز' اے' توبہ'
جیسے مرمر کا بُت کدہ ہو کوئی
نگہ شیشہ باز' اے توبہ
دل کا پتھر پگھل گیا تنویرؔ
خوشبوؤں کا گداز اے توبہ

نظر ثانی
۱۷/۹/۹۴
دہلی

غزل

دِل کا سورج بھی ہے اب نیم بہ زباں کیا کیجے
بڑھتے جاتے ہیں سرابوں کے نشاں کیا کیجے

شہرِ خوشبو کا مغنّی وہی آوارہ مزاج
دشت در دشت غزل خواں ہے اسے کیا کیجے

خس بدنداں ہی سہی برق نشیمن کی طرح
ہر نفس تارِ گریباں ہے اسے کیا کیجے

پھول خوشبو سے بھی جل اٹھتے ہیں داغوں کی طرح
شاخِ گل سوختہ ساماں ہے اسے کیا کیجے

خاک اڑانے کو تو آتے ہیں بگولے بھی یہاں
قافلہ قافلہ ہے ریگِ رواں کیا کیجے

ہم تو ٹھہرے ہیں مگر وقت ٹھہرتا ہے کہاں
پل کی خوشبو ہے یہ دورِ گذراں کیا کیجے

آرزو شمع شبستانِ وفا ہے تنویرؔ
زندگی خوابِ گریزاں ہے اسے کیا کیجے

۱۶/۹/۹۴
دہلی

غزل

کیوں ذہن کے اندھیروں سے منظر بنایئے
بہتر یہی ہے دھوپ میں چہرہ چھپایئے

ہونٹوں کے موتیوں کو بکھرنے بھی دیجئے
پانی کے پھول چُنیئے، تو لڑیاں بنایئے

جو شخص زندگی کے سناتا رہا ہے گیت
اب اس کو ڈھونڈنے کسی مقتل میں جایئے

کب تک کسی "مسیح" کی آمد کا انتظار
چلیے اور اپنی اپنی صلیبیں اٹھایئے

کیوں جمع کیجیے جگرِ لخت لخت کو
پھولوں سے اب لہو کے نیا دل بنایئے

اب کس سے کہیے، اپنی شکستِ انا کی بات
پتھر جو مارے اس کا بھی احساں اٹھایئے

تنویرؔ آنسوؤں کے تو سب جل بجھے چراغ
زخموں کے لمس سے کوئی مشعل جلایئے

نظرِ ثانی
۱۸/۹/۹۴
دہلی

غزل

نظر نظر میں یہ منظر بدلتا رہتا ہے
بتوں کے ساتھ ہی آذر بدلتا رہتا ہے

یہ دھڑکنوں کا سا عالم ہے کیا کیا جائے
قدم قدم پہ یہ محشر بدلتا رہتا ہے

یہ رنگ و بو نہیں صورت کدہ ہے خوابوں کا
کرم کے ساتھ یہ ساغر بدلتا رہتا ہے

ادا ادا پہ، تبسم ہو یا تکلم ہو،
دلوں کے رقص کا محور بدلتا رہتا ہے

جہاں تم آج ہو کل تک وہیں تو ہم بھی تھے
یہ وقت ہے جو مقدر بدلتا رہتا ہے

نظر میں اپنی کسی شیشہ گر کا خواب لیے
سراب زاروں میں پتھر بدلتا رہتا ہے

جہانِ لفظ و معانی کا ذکر کیا تنویرؔ
کہ حرف حرف کا پیکر بدلتا رہتا ہے

۲۱/۹/۹۴
دہلی

غزل

نظر میں یہ جو دھند لکوں بھرا سویرا ہے
اسی کو شوق کی واماندگی نے گھیرا ہے

یہ روشنی کا جزیرہ کہ جس کو دل کہیے
یہیں تو وقت کی تاریکیوں کا ڈیرا ہے

شکستہ دل میں بھی کچھ دھڑکنیں جو باقی ہیں
انھیں پہ وقت کا سایہ بہت گھنیرا ہے

جو خواب ٹوٹ گئے خوشبوؤں کے رہبر تھے
اب ان کو ڈھونڈنے نکلو تو گھپ اندھیرا ہے

یہ چاند تاروں کی لڑیاں جو مسکراتی ہیں
گزر گئے ہیں جو موسم یہ اُن کا پھیرا ہے

یہ تیرگی کہ افق تا افق ہے دام بدست
اسی کے حلقۂ تسخیر میں بسیرا ہے

جو لکھ رہے تھے غزل بھول کیوں گئے تنویر
یہ تتلیوں کا قفس خوشبوؤں کا گھیرا ہے

بعد نظر ثانی

۲۶/۹/۹۴
دہلی

غزل

زندگی کی کوئی تصویرِ خیالی بھی نہیں
اس مُرقع میں کوئی نقشِ، مثالی بھی نہیں

راستے ختم ہوئے اور سفر باقی ہے
خود نئی راہ کوئی ہم نے نکالی بھی نہیں

شہرِ دل کی تو علامت ہیں نئی دیواریں
شیشۂ دل بھی نہیں جامِ سفالی بھی نہیں

دل کے اوراق ہیں آتش زدہ پھولوں کی طرح
شمعِ گریاں جو نہیں شعلہ مقالی بھی نہیں

میرے کاندھوں پہ ہے ناکردہ گناہوں کی صلیب
اب یہ ممنوعہ شجر کی کوئی ڈالی بھی نہیں

خوشبوؤں کی طرح دیتا ہے دلوں پر دستک
اور دیکھو تو کسی در کا سوالی بھی نہیں

داستانِ غمِ دل لکھ تو چکے ہو تنویرؔ
اب کوئی صفحہ ان اوراق میں خالی بھی نہیں

نظر ثانی
۲۷/۹/۹۴
دہلی

غزل

شام سے صبح تک صبح سے شام تک
رقصِ آغاز سے، رقصِ انجام تک

فردِ احساس پہ ان گنت نام تھے
جستجو آ گئی نقشِ بے نام تک

لفظ در لفظ معنی بہ معنی بھی تھا
مے سے میخوار تک جرعہ سے جام تک

میرے آوارہ سجدوں کی زنجیر تھی
تارِ زنار سے تارِ احرام تک

کوئی آئینہ دل میں دھڑکتا رہا
محفلِ ناز سے جلوۂ بام تک

اب قدم ہوں تو کوئی زمیں بھی تو ہو
دشتِ غربت بھی تھا نقشِ یک گام تک

اب قفس بھی ہے تنویرِ فانوسِ دل
شوقِ پرواز تھا، دانہ و دام تک

نظرِ ثانی
۲۶/۹/۹۴
دہلی

غزل

ان حسیں تیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے
دل کی تعزیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

درد کے حرف سہی زخموں کے الفاظ سہی
ایسی تحریروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

آج کا ذہن ہے احساس کے ریشم میں اسیر
سادہ زنجیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

جن کی خاطر کوئی مقتل میں چلا آتا تھا
ایسی شمشیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

کہکشاں ریت کی پلکوں پہ سجاؤ، دیکھو
دل کی تصویروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

خواب تھے ٹوٹ گئے شیشے کے پھولوں کی طرح
ایسی تعبیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

وقف تھے جن کے لیے عشق کے سجدے تنویر
دل کی تعمیروں کے اب تو کوئی معنی نہ رہے

بعد شام نظر ثانی

۲۷/۹/۹۳
دہلی

نظمیں

صدائیں

آسمان

مرے سینہ میں، فطرت کا خزانہ
مرے بربط میں، فردوسی ترانہ
مری خاموشیوں میں اک تکلّم
مری نظروں میں قدرت کا فسانہ
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

کوہسار

ہیں، میری وادیاں، گلشن بداماں
مچلتی ہیں، مری گودی میں ندیاں
مرے اثبات پر، نازاں ہے قدرت
مرے دل میں ہزاروں راز پنہاں
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

گلستان

جھلکتی ہے، مرے رُخ پر جوانی
مری ہر سانس کوثر کی روانی
مرا ہر پھول اک منشورِ فطرت
مرے نغمے، محبّت کی کہانی
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

آبشار

مرے نغمات ں کا تبسم
مری آواز، فطرت کا تکلم
اترتے ہیں، ربابِ کہکشاں سے
مرے تاروں میں فردوسی ترنم
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

مقبرہ

مری ہر سانس ہے اک سازِ ہستی
مری ہر بات ہے اک رازِ ہستی
تکلم سے بھری میری خموشی
مری آواز ہے آوازِ ہستی
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

سمندر

تموج میں مرے، نغمات لرزاں
ہیں آسودہ ہزاروں مجھ میں طوفاں
مرے ساحل پہ رقصِ ماہ و انجم
مری گہرائیاں فارونِ ساماں
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

ویرانہ

مری ہر سانس اک مُردہ تمنّا
بسی ہے مجھ میں مایوسی کی دنیا
زباں ہے میری محرومِ تکلّم
مرا ہر ایک ذرّہ چشمِ بینا
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

آفتاب

تجلّی زارِ فطرت، مرا سینہ
رواں شام و سحر میرا سفینہ
ہر اک ذرّہ مرے جلووں سے روشن
سما سے تا سمک ہے میرا زینہ
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

چاند

رواں ہے دوشِ شب پر میرا محمل
کواکب زارِ فطرت، میری منزل
رگِ ہستی کی رو، مرا تبسّم
مرے دامن پہ رقصِ موجِ ساحل
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

فطرت

مری ہر سانس میں اک زندگی ہے
نگاہوں میں مری تابندگی ہے
مرا ہر ذرّہ اک عنوانِ تازہ
مرے قانون میں پائندگی ہے
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء
جھنجھانہ (ضلع مظفرنگر)

زندگی کے لیے

جہاں و جاں کی کشاکش، یہ زیست کے آداب
یہ زندگی کا تبسم، یہ تلخیٔ زہراب
سمجھ کے شہد، ہلاہل کو پی رہا ہوں میں
میں جانتا ہوں، کہ کس طرح جی رہا ہوں میں

—

حیات و وقت کی ہر کشمکش سے گذرا ہوں
بلندیوں سے گرا، پستیوں سے اُبھرا ہوں
تغیرات نے ہر ہر قدم پہ ٹوکا ہے
حوادثات نے بڑھ بڑھ کے مجھ کو روکا ہے

—

میں، زندگی کے، ہر اک موڑ پر، ہوا بیدار
اُلجھ کے رہ گیا، قدموں سے ہر سراب و غبار
تبسمات کے پردوں میں، غم کو ڈھانپ لیا
کہ زندگی کے ارادوں کو میں نے بھانپ لیا

—

شعارِ زیست کو دے دے کے درسِ شکر و شکیب
یہ جانتے ہوئے کھائے ہیں زندگی کے فریب
کہ واقعات کا اک ناتمام سلسلہ ہے
ہماری زیست، فقط اک وسیع تجربہ ہے

حیات ہو گئی جب شدّتِ الم سے نڈھال
حواس و ہوش کی تلخی نے کردیا پامال
سکونِ روح کو جب وقت نے جھنجھوڑ دیا
جگر کے زخم کے ٹانکوں کو توڑ توڑ دیا

یہ سوچ کر میں ہوا بے خودِ شراب و گناہ
کہ ان دھندلکوں میں مل جائیں گے سکون و پناہ
غمِ حیات سے جو لمحہ بے خبر گذرے
وہی تو اصل میں اس زندگی کا حاصل ہے

یہ اک حسین سا دھوکا تھا، کوششِ ناکام
کہ غالب آہی گئی اس پہ گردشِ ایام
یہ بے خودی بھی غمِ زیست کو مٹا نہ سکی
مجھے شباب کے پہلو میں نیند آ نہ سکی

گناہ میں نے کیے نیتِ گناہ نہ تھی
کہ "زندگی کے لیے" اور کوئی راہ نہ تھی
چراغِ روح کو تاریکیوں نے گھیرا تھا
مری نگاہ کے آگے فقط اندھیرا تھا

۱۵ جون ۱۹۴۵
کیرانہ

زوالِ آدم

گاؤ اے معصوم پرندو

.———.

موت کی اس غم گین وادی میں
زیست کی شمعیں روشن کر دو
اپنی ازلی موسیقی سے
ایک مقدّس مستی بھر دو

.———.

تیرہ اور مسموم فضا میں
نغمہ و نور کے پھول کھلا دو
اپنی شیریں آوازوں سے
امرت کی بوندیں ٹپکا دو

.———.

یہ بے باکی، یہ آزادی
فطرت کے پیغمبر ہو تم
دنیا کے معصوم فرشتو
انسانوں کے رہبر ہو تم

.———.

اس ارضی جنت میں ہر سو
پھیلے ہیں زہر اور ناپاکی
باغی ہے اللہ کا نائب
یہ آدم یہ پُتلۂ خاک

آدم و حوّا عاصی بنکر
نکلے تھے فردوسِ بریں سے
یونہی چھوٹ جائے گی شاید
یہ جنّت اِس خاک نشیں سے

پھول اور شبنم کی یہ وادی
نور اور خوشبو کی یہ محفل
ہے یہ آزادوں کی دُنیا
ہے یہ معصوموں کی منزل

بھیگ رہی ہے خونِ شفق سے
ہر شئے اِس تاریک فضا میں
موت کے ہونٹوں پر ہے تبسم
چیخیں ہیں خاموش ہوا میں

۱۸/اگست ۱۹۵۰ء
آسارا

اہرام

یہ فلک بوس عمارت یہ مقدس اہرام
ارضِ مشرق کے خداؤں کی یہ تعمیر عظیم
عظمتِ رفتۂ ماضی کے یہ کہنہ تعویذ
مدفنِ عہد قدامت یہ لحد زار قدیم

یہ تراشیدہ چٹانیں یہ کہن سال ستون
اک شہنشاہ کے سنگین عزائم کا ثبوت
ہیبتِ رنجِ کلہی سطوتِ آداب شہی
زندگی کے لبِ فریاد پہ یہ مہرِ سکوت

وقت کے سینہ پہ دیرینہ روایات کی سِل
آرزوؤں کے نفس زار میں یہ سنگِ جمود
قوت و جبر و تشدّد کا یہ پُرہول نشان
نوعِ انساں پہ یہ انساں کی خدائی کی نمود

سطحِ صحرا پہ یہ تہذیب کی سنگین لحد
جس میں مدفون ہیں تاریخ کے صدہا اسرار
ریت کے ذروں پہ یہ نقشِ کفِ پائے آدم
جس کے شانوں پہ ہے بیتی ہوئی صدیوں کا غبار

اب بھی مشرق پہ ہے اس عظمتِ رفتہ کا فسوں
زندگی اب بھی ہے اس سحرِ نظر سے لرزاں
اب بھی معتوب ہیں سرمایہ و شاہی کے عوام
اب بھی ہے پشتِ غلامی پہ وہی سنگِ گراں

تازیانے وہ لچکتے ہوئے سانپوں کی طرح
اور مشرق کے غلاموں کا وہ اک جمِّ غفیر
دیوتاؤں سے بھی افضل تھی وہ انسانوں کی بھیڑ
جس نے یہ ہیکل و اہرام کیے تھے تعمیر

نیل کی موجِ تلاطم کی طرح ذروں سے
وقت کا سیلِ رواں رک نہیں سکتا اے دوست
جبر و قوت کی خدائی میں ہمیشہ کے لیے
نوعِ انسان کا سر جھک نہیں سکتا اے دوست

۱۸ جولائی ۱۹۵۱ء
دہلی

گل و بلبل کی سرزمین سے

زمانہ ڈھونڈتا ہے تیرے اُس عہدِ مُعلّیٰ کو
تری فردوسِ گم گشتہ کو اس نقشِ مجلّیٰ کو
کنارِ آبِ رُکنا باد و گل گشتِ مصلّیٰ کو

خُموں میں تیرے اب تک وہ مئے دوشینہ باقی ہے
وہی پیرِ مغاں ہے ساغر و مینا ہے ساقی ہے
یہاں خیّام ہے حافظ ہے سعدی ہے عراقی ہے

یہاں آئینِ کسریٰ بھی ہے مُزدک کا قرینہ بھی
یہاں زردشت بھی ہے جلوۂ ماہِ مدینہ بھی
یہاں آتش کدہ بھی ہے فروغِ طورِ سینا بھی

مگر محفل میں تاریکی ہے ظلمت ہے دماغوں میں
کہ تیرا خونِ دل جلتا ہے مغرب کے چراغوں میں
"مئے باقی" نہیں اب زہر ہے تیرے ایاغوں میں

کہوں کیا تشنۂ مضراب تیرا ساز ہے کب سے
طلسمِ "ہیچ مقداری" ترا اعجاز ہے کب سے
زمانہ منتظر ہے گوشِ بر آواز ہے کب سے

ذرا تو فہم تو کر وقت کے نازک اشاروں کو
ذرا تو چھیڑ تو دے روح کے افسردہ تاروں کو
ذرا آواز تو دے عمرِ رفتہ کی بہاروں کو

فضا میں وقت کے طائر کی پھر یہ بال جنبانی
ترے مشرق میں یہ انوارِ صبحِ نو کی تابانی
فلک کی رنگ افروزی افق کی شعلہ سامانی

عمل میں پھر تجھے وہ جذبۂ تسخیر لانا ہے
نظامِ نو سے پھر اک تیشۂ تدبیر لانا ہے
تجھے فرہاد بن کر پھر سے جوئے شیر لانا ہے

چمن میں نغمۂ بلبل کو پھر آوارہ ہونا ہے
کہ اس دامِ ہوائے گل کو اب صد پارہ ہونا ہے
تجھے فردوسِ گوش و جنتِ نظارہ ہونا ہے

۲ جنوری ۱۹۵۲ء

آسارا

رومتہ الکبریٰ

تیرا افسانۂ ماضی، ترے آدابِ کہن
تیری تہذیب کی عظمت، تری شاہی کا عروج
جس نے روندی تھی کبھی مشرق و مغرب کی زمین
تیری قوت کا وہ طوفاں، ترے لشکر کا خروج

ترے شاہوں کی جبینوں میں خداؤں کا وقار
ترے دربار میں سجدوں کا، سلاموں کا ہجوم
ترے بازار میں عصمت کا وہ زریں نیلام
تیری سڑکوں پہ پری زاد غلاموں کا ہجوم

جس میں انسان ہی انسان کا صیاد بنا
ہاں وہ تفریح و تفنن وہ ترے سیر و شکار
موت کے کھیل سے خوش ہوتی تھیں جن کی روحیں
تجھ میں ایسے بھی تھے کچھ ماہ لقا خنجر نگار

تری وحشت کا یہ انداز نیا دیکھا ہے
خود ترے خون کے چھینٹے ہیں ترے دامن پر
لگ گئی آگ "چراغِ تہہ داماں" سے تجھے
بجلیاں گرتی ہیں اپنی ہی ترے خرمن پر

تیرے محلوں کی کنیزوں نے جسے چھیڑا تھا
اب بھی ہے دہر میں وہ سازِ مسرت لرزاں
تیرے بازارِ تمدّن میں جو بکتی تھی کبھی
اب بھی دنیا میں ہے وہ جنسِ غلامی ارزاں

تیری تہذیب کے ہاتھوں نے جلایا تھا جسے
طاقِ مغرب میں فروزاں ہے ابھی تک وہ چراغ
آبِ خنجر سے ترے جس میں لہو ٹپکا تھا
اب بھی ہے خون سے لبریز وہ مشرق کا ایاغ

اب بھی ہے جبر کے ہاتھوں میں سیاست کی زمام
زندگی سلسلۂ دار و رسن ہے اب تک
اب بھی جمہور سے برہم ہے سلاطیں کا مزاج
تیری تاریخ کے ماتھے پہ شکن ہے اب تک

۱۴/اکتوبر ۱۹۵۲ء
آسارا

دیوارِ چین

سینۂ دہر پہ بل کھاتی ہوئی یہ دیوار
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے صدیوں کا غبار
چہرۂ ارض پہ ماضی کی یہ سنگین لکیر
زیست کے پاؤں پہ وقت کی بھاری زنجیر

یہ کہن سال عمارات یہ بنیادِ قدیم
سنگ اور وحشت کی یہ کاہکشاں سدِّ عظیم
دوشِ مشرق پہ یہ تسخیر و تشدّد کی کمند
ہم عناں جس سے رہا سطوتِ شاہی کا سمند

شیوۂ جبر کے ماتھے کی یہ پُر ہول شکن
اور غلامی کا یہ اک لاشۂ بے گور و کفن
عہدِ رفتہ کی یہ تاریخِ شکست و یلغار
چین کا لشکرِ صف بستہ یہ غولِ تاتار

ہاں یہ پستی یہ بلندی یہ تنزّل یہ عروج
ایک قوت کی شکست ایک نئی قوت کا خروج
اور یہ قرنوں کی علامات یہ صدیوں کے نشاں
زیست کی راہ میں ہر گام پہ اک سنگِ گراں

سینکڑوں سال کی جنگوں کی یہ خونی تاریخ
اہلِ دولت کی امنگوں کی یہ خونی تاریخ
آج تک راہ میں انسان کے کھڑی تھی یونہی
بیڑیاں بن کے یہ پاؤں میں پڑی تھی یونہی

سینکڑوں سال کی ہر ملک میں دیواریں ہیں
سینکڑوں دام ہیں زنجیریں ہیں اور دراریں ہیں
لیکن اب وقت نے ہر دامِ کہن توڑ دیا
نوعِ انسان کے رشتوں کو بہم جوڑ دیا

وقت کے دوش پہ اب دار نہیں رہ سکتی
زیست کی راہ میں دیوار نہیں رہ سکتی

یکم دسمبر ۱۹۵۲ء
آسلا

ممی

تیرے سینے میں ہے مدفون وہ عہدِ تاریخ
جس کی خود "ہیروغلیفی" میں کھنچی ہے تصویر
تیرے ماتھے پہ ہے اس عظمتِ پارینہ کا نشاں
جس کے سائے میں یہ اہرام ہوئے تھے تعمیر

. —— .

تیرے چہرے میں ہے "اسفنکس" کے چہرے کا جلال
روحِ "آمون" کا سر پر تیرے ہے پرِ عقاب
فاش ہیں تیری نگاہوں پہ وہ اسرارِ نہاں
وقت نے ڈال دیا جن کی حقیقت پہ نقاب

. —— .

تجھ کو اس نیک دل انساں نے خدا ہی سمجھا
جو عبادت پہ ہمیشہ ہی کمر بستہ رہا
دیوتا روپ میں انسانوں کے آتے ہی رہے
اور خدا جس کے لیے عقدۂ سربستہ رہا

. —— .

تیرے دربار میں انساں کی وہ چڑھتی ہوئی بھینٹ
خونِ آدم سے تھے رنگین تیرے سیف و سبو
معبدوں میں بھی وہی کھیل رچا جاتا تھا
دیوتاؤں کو بھی مرغوب تھا انساں کا لہو

وادیٔ نیل کی تہذیب کا وہ دورِ عروج
آج تک عظمتِ اہرام ہے خود جس کی گواہ
نوعِ انسان کے نشانوں کی بلندی جس کو
مل سکی تیری خدائی کے تصور میں پناہ

قعرِ ماضی سے زمانے نے نکالا ہے تجھے
جسم قائم ہے مگر روح تری ہے مفقود
تیرے سینہ میں جواہر کا خزانہ ہے مگر
روشنی اور حرارت تو نہیں ہے موجود

یہ طلسماتِ عجائب ہے بہت خوب مگر
اب اسے دیکھ کے ہم ہوش نہیں کھو سکتے
آکے اس عہدِ گذشتہ کے ممی خانے میں
آج ہم موت پہ ماضی کی نہیں رو سکتے

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء
آسارا

ریشم

جیسے پھولوں کے صحیفوں کے ورق کھل جائیں
دل کی تحریر ہے شبنم کی لڑی کہیئے جسے
جیسے تصویر بہ تصویر ہوں یادوں کے نقوش
حسن کا لمس ہے ریشم کی لڑی کہیئے جسے

جیسے نیلم کی چٹانوں میں تراشے ہوئے پھول
جن کو چھوتی ہیں، ہوائیں تو مچل جاتی ہیں
دل سے اٹھتی ہیں جو لہریں وہ لبوں تک آ کر
مسکراتی ہوئی خوشبوئیں بدل جاتی ہیں

آئینے لے کے تو کلیاں، کبھی کھلتی ہی نہیں
آئینے لے کے تو آنکھوں کے سلام آتے ہیں
حسنِ بیگانگیٔ معنی کو بھلا کیا سمجھے
نفسِ شوق میں پھولوں کے پیام آتے ہیں

اس کو تم صبحِ بہاراں کا مقدر سمجھو
رنگ و بو پھول بنیں اور نکھرتے جائیں
کوچۂ زلف میں آئے تو صبا رقص کرے
اور کلیوں کے حسیں خواب بکھرتے جائیں

خمِ ابرو میں بھی بت خانے سجے رہتے ہیں
لالہ و گل میں کشش ہے وہ نگاہوں کے لیے
لمس، خوشبو کی طرح دل میں اُتر جاتا ہے
پھول حلقوں میں سمٹ آتے ہیں باہوں کیلیے

لب و عارض کو شگوفوں کی طرح کھلنا ہے
شاخِ گلُ ہے تو لہکنا ہے اسے کیا کیجیے
رات کا حُسن سمیٹا تو نہیں جا سکتا
زُلفِ سنبل کو مہکنا ہے اسے کیا کیجیے

برق تو برق ہے کیوں پردۂ محمل میں رہے
وہ نشیمن بھی نہیں، کُنجِ قفس ہے کیسے جسے
دل کی بھیدوں بھری خوشبو سے مہک اٹھتا ہے
وہ رگِ گل بھی نہیں، تارِ نفس کہیے جسے

یوں تو ہر خواب یہاں وجہ شکستِ دل ہے
خواب پھر خواب ہیں پلکوں میں سجے رہتے ہیں
زندگی ہے بھی کہاں بھول بھلیوں کے سوا
آئینے ہیں کہ دھندلکوں میں سجے رہتے ہیں

۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء
دہلی

کونارک

عہدِ رفتہ کا یہ حسین کھنڈر
سوریہ مندر کا دل نشین کھنڈر
پیکرِ آب و گل کہیں جس کو
مُحملہ جان و دل کہیں جس کو

اس کے آثارِ خستگی کے نقوش
اس کے دورِ شگفتگی کے نقوش
منظرِ دیدہ زیب ہیں اب بھی
کس قدر دل فریب ہیں اب بھی

ساز و آہنگ کا یہ نقشِ جمیل
رامش و رنگ کا یہ نقشِ جمیل
رگِ جاں ہے پگھلتی جاتی ہے
روح نغموں میں ڈھلتی جاتی ہے

کیا قیامت ہے حسنِ پیکر بھی
آئینہ بن گیا ہے پتھر بھی

وقت ہے قیدِ آبگینوں میں
زلف و رخ کے حسیں سفینوں میں
صبح ہے عارضِ صبا کی طرح
شام ہے زلفِ سرمہ سا کی طرح

برق و شبنم بدلتے رہتے ہیں
دل کے موسم بدلتے رہتے ہیں
خوشبوؤں کو جو رنگ ملتے ہیں
پھول، شاخ ادائیں کھلتے ہیں

زندگی موجِ رنگ ہو جیسے
ہر نفس جل ترنگ ہو جیسے
عرضِ نغمات کہہ سکیں جس کو
رقصِ لمحات کہہ سکیں جس کو

گردشِ وقت کے یہ پیمانے
روز و شب کے حسین افسانے
سلسلہ اس پہ آٹھ پہروں کا
ابدی رقص جیسے لہروں کا

آب و گل کا طلسم کہیئے جسے
کیا حسیں شے ہے جسم کہیئے جسے
جیسے خوشبو کا آبگینہ ہو
ریشمی دھوپ کا سفینہ ہو

کشش حسنِ دلنواز کی بات
تارِ سنبل کی اور گداز کی بات
آگ ہے شبنمی نقابوں میں
بجلیاں قید ہیں حبابوں میں

کتنے معصوم کتنے سرکش ہیں
یہ کہ تیرِ ادا کے ترکش ہیں
ایک فتنہ علامتیں دو دو
ایک دِل اور قیامتیں دو دو

سانس لیتی ہوئی یہ پنکھڑیاں
جیسے رنگوں کی ریشمی لڑیاں
شاخِ گل اور ادا سے لچکی ہوئی
لب و عارض کی دھوپ مہکی ہوئی

خلشِ جان و دل ارے توبہ
کششِ آب و گل ارے توبہ
کتنی لذّت ہے ناصبوری میں
کتنی نزدیکیاں ہیں دوری میں

خود سے ہر دم مچلتا رہتا ہے
آگ میں اپنی جلتا رہتا ہے
دل کہ دیوانہ کہہ سکیں جس کو
رقصِ پروانہ کہہ سکیں جس کو

حسن کی اک ادائے ناز کے ساتھ
روح کے لمس و اہتزاز کے ساتھ
کتنے جذبے اُبھرتے جاتے ہیں
رگِ جاں سے گذرتے جاتے ہیں

جیسے حلقے ہوں دامِ شبنم کے
جیسے طوفاں ہوں دل کے ریشم کے
ہوش ہے فصلِ گل کے آنے تک
دل کے پھولوں کے مسکرانے تک

جیسے پھولوں کے لمس کی نرمی
جیسے آغوشِ ناز کی گرمی
آتشِ شوق کو جگاتی ہوئی
رات اور وہ بھی مسکراتی ہوئی

لمحہ لمحہ کشش یہ پھولوں کی
جیسے خوشبو ہو شب کے پھولوں کی
دل سے شعلے لپٹتے جاتے ہیں
اور بازو سمٹتے جاتے ہیں

جیسے خوشبو کو رنگ ملتے ہوں
پھول شاخِ ادا میں کھلتے ہوں
آب و گل کا چمن لہکتا ہو
چاند تاروں کا بن مہکتا ہو

"رتی رس" بن کے سحر چھلکا ہوا
دل کا آب حیات چھلکا ہوا
جب دھنک ٹوٹ کر بکھرتی ہے
کہکشاں کہکشاں گذرتی ہے

دلِ پُر آرزو کی تیشہ گری
نفسِ شوق کی یہ شیشہ گری
شہرِ سنگ اور سوادِ جاں کی طرح
خاکِ دل اور آسماں کی طرح

وہ جسے ارتعاشِ ساز کہیں
روح کا رقصِ دلنواز کہیں
زندگی کا حسیں فسانہ ہے
آب و گِل کا نگار خانہ ہے

اپنے مظہر تلاش کرتی ہے
روحِ پیکر تلاش کرتی ہے
خود سے آتش بجام رہتی ہے
اور پھر تشنہ کام رہتی ہے

رنگ در رنگ یہ نشانِ حیات
نقش در نقش یہ جہانِ حیات
کتنے جلوے ہیں جسم و جاں کیلیے
دیدہ و دل کے امتحاں کے لیے

۷ ستمبر ۱۹۹۰ء
دہلی

گریبانِ سحر

وہ گریباں کہ گریبانِ سحر کہیے جسے
وہ اجالوں کی حسیں راہ گذر کہیے جسے
حلقۂ گل کو سجانے کی ادا ہائے توبہ
اور پھر اس پہ لجانے کی ادا ہائے توبہ

تابِ رخ ہے تو اسے حسنِ نظر بھی دیجئے
دل کی دھڑکن کو نگاہوں کی خبر بھی دیجئے
مسکراہٹ ہے کہ پلکوں میں چھپی رہتی ہے
روشنی ہے کہ دھندلکوں میں چھپی رہتی ہے

رشتہ در رشتہ ہے وہ زلفِ رسا کہیے جسے
نگہ شوق ہے وہ دستِ صبا کہیے جسے
پھول کھلتے ہیں جو آنکھوں میں حیا آتی ہے
دل کی خوشبو لیے دامن کی ہوا آتی ہے

فاصلے ہیں بھی تو دامن کی کشش ہیں گویا
دوریاں ہیں بھی تو خوشبو کی خلش ہیں گویا
پھول تو پھول ہیں دیوار نہیں بن سکتے
رگِ جاں کے لیے تلوار نہیں بن سکتے

آب پارہ بھی ہے وہ موم کی سِل کہیے جسے
آبگینوں کا حسیں شہر ہے، دل کہیے جسے
کچی کلیاں ہیں انہیں ناز سے کھلنے دیجیے
رنگ پھولوں کی دھنک ہیں انہیں ملنے دیجیے

کوچۂ زلف کے جب سائے لہک اٹھتے ہیں
لب و عارض کے حسیں پھول مہک اٹھتے ہیں
ناز سے رنگِ حنا ہے کہ نکھر جاتا ہے
دل کا ریشم ہے کہ ہونٹوں پہ بکھر جاتا ہے

خواب آنکھوں میں بکھرتے ہوئے پھولوں کی طرح
سائے یادوں کے نکھرتے ہوئے پھولوں کی طرح
جال شبنم کے، وہ خوشبو کی حسیں راہوں میں
کہکشاں ناز سے لہراتی ہوئی باہوں میں

دل کا ریشم وہ جیسے زلفِ پریشاں کہیے
نیم کش تیر جیسے تارِ رگِ جاں کہیے
شکن آلود جبیں ہو تو اسے کیا کیجیے
تیکھی چتون بھی حسیں ہو تو اسے کیا کیجیے

وہ حسیں جسم کہ خوشبو کا بدن کہیے جسے
جام صہبا کہ لبِ توبہ شکن کہیے جسے

حسن کی مئے جسے آنکھوں سے بھی پی سکتے ہیں
ایک لمحہ کو ہمیشہ بھی تو جی سکتے ہیں

۲۷ نومبر ۱۹۹۰ء دہلی

دستہ دستہ گلاب

وہ ہاتھ پھولوں کا ہم خواب کہہ سکیں جنکو
وہ ہاتھ مخمل و کم خواب کہہ سکیں جنکو
وہ ہاتھ پھول ہیں اور کتنے نرم و نازک ہیں
نظر کی بھول ہیں اور کتنے نرم و نازک ہیں

وہ ہاتھ جنبشِ دستِ صبا کے محرم ہیں
وہ ہاتھ رشتۂ بندِ قبا کے محرم ہیں
وہ بجلیاں ہیں مگر حسنِ اہتزار کے ساتھ
وہ شیشہ شیشہ ہیں اور ریشمی گداز کے ساتھ

وہ ہاتھ ہیں کہ اداؤں کا فالنامہ ہیں
وہ تیکھی تیکھی لکیریں سوالنامہ ہیں
حسیں خیال ہیں دل کو لبھاتے رہتے ہیں
وہ آئینوں کی طرح مسکراتے رہتے ہیں

وہ ہاتھ روح کا ریشم سمیٹ لیں جیسے
دلوں کے پھولوں کی شبنم سمیٹ لیں جیسے
[illegible] نازکہ لمس جنوں کہیں جس کو
[illegible]ضطراب کہ دل کا سکوں کہیں جس کو

وہ انگلیاں ہیں کہ نازک سے برق پارے ہیں
چراغ و شمع کی صورت حسین شرارے ہیں
یہ کیا طلسم ہے خوشبو میں رنگ ملتے ہیں
نظر نظر میں شہابوں کے پھول کھلتے ہیں

وہ ہاتھ پھول سے خوابوں کے سلسلے بھی تو ہیں
وہ دستہ دستہ گلابوں کے سلسلے بھی تو ہیں
وہ ہاتھ مہندی کے پھولوں سے لالہ زار بھی ہیں
وہ نقش ناز کہ افسانۂ بہار بھی ہیں

وہ ہاتھ پھول ہیں پھولوں کی راگ مالا ہیں
وہ خوشبوئیں ہیں کہ ان کی سہاگ مالا ہیں
وہ ہاتھ حسن کی مے کے ایاغ ہیں گویا
وہ ہاتھ محفلِ دل کے چراغ ہیں گویا

وہ ہاتھ جیسے نشانی ہوں آرزوؤں کی
وہ ہاتھ جیسے کہانی ہوں جستجوؤں کی
ورق ورق وہ تمنا کے باب ہیں گویا
وہ ہاتھ دیدہ و دل کی کتاب ہیں گویا

وہ ہاتھ گردشِ فانوس کہہ سکیں جن کو
وہ پھول ذہن سے مانوس کہہ سکیں جن کو

۱۴ اپریل ۱۹۹۳ء

یادوں کے سائے

•

سلسلے یہ حسین، یادوں کے
قافلے دل نشین، مرادوں کے،
مُتحرک ہیں، دل کی تصویریں
خُوشبوؤں کی حسین زنجیریں

تُم انھیں دل کے داغ ہی کہہ لو
حسرتوں کے چراغ ہی کہہ لو
یہ نشاناتِ جُستجو بھی تو ہیں
منظرِ شہرِ آرزو بھی تو ہیں

قافلے اور حسیں خوابوں کے
دور تک، سلسلے شہابوں کے
کارواں کارواں گزرتے ہوئے
کہکشاں کہکشاں گزرتے ہوئے

زندگی کی اُداس راہوں میں
زخم در زخم سیر گاہوں میں
جیسے کوئی ایاغ رکھ جائیے
چپکے چپکے چراغ رکھ جائیے

سایہ سایہ ببول کھلنے لگیں
دل کے ریشم میں پھول کھلنے لگیں
وادیٔ جاں میں شام رقص کرے
تشنہ ہونٹوں پہ جام رقص کرے

میکدہ آب و گِل میں چھلکا ہو
شیشۂ شیشۂ گلاب چھلکا ہو
اُٹھ رہے ہوں پرت حجابوں کے
پھول اوراق ہوں کتابوں کے

اور یہ حرف و قلم کی تصویریں
دل نشیں خوشبوؤں کی زنجیریں
لمحہ لمحہ کہانیوں کی طرح
بجلیاں اور نشانیوں کی طرح

دل کی دھڑکن بھی دل کا حصہ ہے
یہ بھی تنہائیوں کا قصہ ہے
جو مرے غم کا ترجماں بھی ہے
مری خوشیوں کی داستاں بھی ہے

یہ رگ جاں کی پرلرزشوں کا صلا
دل کے داغوں کی آرزشوں کا صلا
بن کے خوشبو جو مہکا رہتا ہے
دل کا ہر داغ مہکا رہتا ہے

نظر ثانی

۱۶ / مئی ۱۹۹۳ء

شاخِ نسترن

نرم و نازک سی وہ حسین لڑکی
وہ جیسے شاخِ نسترن کہیے
کہکشاں وہ بھی دل کے پھولوں کی
وہ جیسے شمعِ انجمن کہیے

جیسے چمپا کی دل نشیں خوشبو
چاندنی کے حسین آنچل میں
مسکراتے ہوئے لبوں کا فسوں
جیسے بکھرا ہو خوابِ مخمل میں

جیسے کھلتا ہوا سفید کمل
ریشمی جھیل میں لہکتا ہو
مے میں ہو صندل و گلاب کا حسن
شیشہ شیشہ پڑا دہکتا ہو

گیت، وہ بھی سحر کے لمحوں کا"
کنواری ندیوں کی لے کہیں جس کو
ہونٹ بھی اس کو چھو نہیں سکتے
دل کے پھولوں کی نے کہیں جس کو

نقرئی نقرئی وہ نقش و نگار،
سنگِ مرمر میں خواب ترشے ہوئے
آب گینوں کا وہ طلسم جمیل"
شیشہ شیشہ، گلاب ترشے ہوئے

سُرخیاں وہ سیاہ بالوں میں
سُرمئی سُرمئی شفق کی طرح،
جن پہ منقوش ہے الف لیلےٰ
رات کے ریشمی ورق کی طرح

تیکھی تیکھی بھووں کی تحریریں
پھول سے نشتروں کی بات کریں
دل میں بھر دیں، نئی بہار کے رنگ
اور پھر خنجروں کی بات کریں

داستاں داستاں وہ سحر و طلسم،
وہ بھی شبنم کی سرحدوں کی طرح
راہ میں، رنگ و بو کی زنجیریں
وہ بھی ریشم کی سرحدوں کی طرح

چپکے چپکے وہ دل میں آتی ہے
صبح کلیوں میں جب اترتی ہے،
ہنس کے سونا بکھیر دیتی ہے
وادیٔ جاں سے جب گزرتی ہے

بعد نظر ثانی
۱۶/۸/۹۴
دہلی

شہرِ احساس

کتنا حسّاس ہے یہ شہرِ جمیل"
جیسے پتھر بھی آبگینے ہیں"
زرفشاں زرفشاں یہ تحریریں
پھول بھی ریشمی سفینے ہیں

خم بہ خم گیسوؤں کے سائے ہیں
دل کی صورت حرم تراشے ہوئے
وقت نے شہرِ آرزو کی طرح،
خوشبوؤں کے صنم تراشے ہوئے

حُسن کا خواب اے خدا کی پناہ
آئینے ساتھ ہیں حجابوں کے
ڈھل گئی ہے شگفتہ پھولوں میں
شُعلے پردوں میں ہیں نقابوں کے

وہ جسے شہر رنگ و بُو کہیے،
داستاں داستاں ہے، کیا کیجے
یہ لڑی ریشمی خیالوں کی،
کہکشاں کہکشاں ہے، کیا کیجے

یہ ورق در ورق کتاب حیات
کتنی تصویروں کا مُرقّع ہے
حلقہ در حلقہ کاکلوں کا یہ رقص
دل کی زنجیروں کا مُرقّع ہے

کھل کے ان ریشمی ہواؤں میں
دل کے زخموں کو پھُول بننے دو
زندگی خود حسین دُھوکا ہے
اُس کی یادوں کو بھُول بننے دو

آرزو ہے کہ شیشۂ ساعت"
ریت پل پل بکھرتی جاتی ہے"
اور یادوں کی یہ حسین دھنک،
شاخِ گُل ہے نکھرتی جاتی ہے

یوں تو پلکوں کی چھاؤں میں اکثر
کوئی افسانہ بنتا رہتا ہے
کشمکش ہے جو بڑھتی جاتی ہے
زخم پیمانہ بنتا رہتا ہے

اِتنی مُدّت کے بعد اے تنویر
آگیا کوئی جیسے خوابوں میں
آپ سے آپ پھر مہکنے لگے"
پھُول رکھے ہوئے کتابوں میں

تحریر
۲۴/۸/۹۴
دہلی

شاخِ گل

شاخِ گُل جیسی وہ حسین لڑکی
شہد جیسی وہ دل نشین لڑکی
جس کو پرچھائیوں کا روپ کہیں
سانولی سانولی سی دھوپ کہیں

جس کو پھولوں کا بت کدہ کہیے
وہ دھنک جس کو رت کدہ کہیے
خواب رقصاں ہوں جیسے پلکوں پر
وقت کے ریشمی دھندلکوں پر

وہ تبسم کا، خوشنما انداز
پھول جیسی وہ ریشمی آواز
موتیوں کی لڑی لہکتی ہوئی
اپنی خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی

رنگ در رنگ ہیں وہ برگِ گلاب
جیسے بیداریوں کا منظرِ خواب
خوشبوؤں کے ایاغ کہیے جنھیں
دل کے روشن چراغ کہیے جنھیں

مسکراتی ہوئی شفق کی طرح
آئینے کے حسین ورق کی طرح
دل کے ریشم سے آکے جُڑتی ہوئی
تتلیاں نگہتوں میں اُڑتی ہوئی

حُسنِ فطرت کی دامگاہوں میں
لُطفِ آغوش کی پناہوں میں
بجلیاں ہیں مچلتی رہتی ہیں
انگلیاں ہیں کہ جلتی رہتی ہیں

جیسے پھولوں کا آرزو نامہ
جیسے خوشبو کا جستجو نامہ
آرزو کھو گئی ہو پھولوں میں
ساز چھڑتے ہوں جیسے پھولوں میں

جیسے شبنم کے آب گینوں میں
نکہت و نور کے سفینوں میں
رقصِ مے ہے کہ جاری رہتا ہے
ذہن پر سحر طاری رہتا ہے

اس کے لہجہ کا لوچ اے توبہ
نشتروں جیسی سوچ اے توبہ
جو نئے ذہن کی علامت ہے
مسکراتی ہوئی قیامت ہے

نظر ثانی کے بعد

۵/۹
۹۹ء دبئی

برگِ حنا

وہ حسیں ہاتھ جیسے برگِ حنا
ریشمی پھول، سادہ تحریریں
خوشبوئیں وہ حسیں لکیروں میں
تارِ شبنم کی جیسے زنجیریں

دل کی دھڑکن نے کہہ سنائی ہو،
وہ کہانی جو پھول جیسی ہو،
سلسلہ وہ بھی دھوپ چھاؤں کا
جس کی تصویر بھول جیسی ہو

اور وہ میدہ و شہاب سا رنگ
جیسے پھولوں میں جل رہے ہوں چراغ
جھیل میں رقصِ آب کا منظر
جس کی لہروں پہ جل رہے ہوں چراغ

خوب صورت خیال کا پیکر
جیسے زُلفِ نگار کی تصویر،
کھینچ دی ہو نظر کے بوسوں نے
شیشہ شیشہ بہار کی تصویر

لمحۂ زر نگار کی خوشبو
آئنہ آئنہ بکھرتی ہوئی
جیسے جس کو بہار ناز و ادا
وہ دھنک رُوح میں اترتی ہوگی

چپکے چپکے وہ نقش و نگار،
نکہتیں اور گل صبا کی طرح
بجلیاں جیسے۔ — آب گینوں میں
شاخِ گُل، خنجر ادا کی طرح

اور وہ پلکیں ہیں کتنی پُراَسرار
اس کے خوابوں کی نجوآ بین بھی ہیں
اَس کی آنکھیں ہزار قاتل ہوں
خود وہ اپنی جگہ حسین بھی ہیں

مسکراتی ہوئی نگاہوں میں
اس کے افسانہ ہائے راز بھی ہیں
جیسے نشتر چھپے ہوں پھولوں میں
دل کو چُھولیں، تو دلنواز بھی ہیں

اس کی یادوں کے ریشمی سائے
جیسے دامن بھرا ہو پھولوں سے
یوں ہی تنویرؔ خواب بنتے رہے
خوب صورت حسین بھولوں سے

نظرِ ثانی
۱۰/۹/۹۴
دہلی

چراغِ نیم شب

دل سے نازک سوال اُلجھے ہوئے
خامشی سے خیال اُلجھے ہوئے
راز در راز گفتگو کی طرح
ایک انجان جستجو کی طرح

غیر معلوم دل نشیں منظر،
خواب در خواب کچھ حسیں منظر
جیسے پروائیاں لہکتی ہوں
جیسے پرچھائیاں مہکتی ہوں

جس کو خوشبوؤں کی خراش کہیں
جس کو پھولوں کا ارتعاش کہیں
مرتعش ساز جیسے پلکوں میں،
چاند اور ریشمی دھندلکوں میں

جس کو شاخِ ادا کہا جائے
رقصِ نازِ صبا کہا جائے
دھوپ سمٹی ہوئی سفینوں میں
آرزوؤں کے آب گینوں میں

ریشمی جھیل، زر نگار کمل
افقِ دل پہ جیسے حرفِ غزل
شیشہ شیشہ نظر بکھرتی ہوئی
موجِ مے کی طرح گزرتی ہوئی

حلقۂ گل میں برگِ کاہ کا رقص
آئنہ آئنہ نگاہ کا رقص
شمع، کنجِ قفس میں جلتی ہوئی
آب گینوں سے لو نکلتی ہوئی

جیسے جوشِ قدح کی موسیقی
جیسے قوسِ قزح کی موسیقی
گھل گئی ہو حسین خوشبوئیں
وقت کی دل نشین خوشبوئیں

وہ حبابوں کا شہر کہیے جسے
خود گلابوں کا شہر کہیے جسے
حرف شیریں بھی ہے غزل بھی ہے
ماہ بھی شیشۂ عسل بھی ہے

آئینے میں کتاب دل کے ورق
کھلتی جاتی ہے آنسوؤں میں شفق
گیت کی لے ہو جیسے شیشوں میں
پھولوں کی مے ہو جیسے شیشوں میں

تکمیل ہو نظر ثانی
۱۲/۹/۹۴
دہلی

شہرِ غزل

پلکوں میں وہ سجے ہوئے خوابوں کے بتکدے
زلفوں کی چھاؤں میں وہ شہابوں کے بتکدے
وہ شیشہ مے تھی کہ پھولوں میں کھو گئی
وہ دھوپ جو سمٹ کے بولوں میں کھو گئی

آنکھیں وہ بوسہ گاہِ حرم کہہ سکیں جنھیں
وہ آئینے کہ رشکِ صنم کہہ سکیں جنھیں
آخر حریم جاں کا نگہبان تو ہو کوئی
افسانہ ہائے شوق کا عنوان کوئی تو ہو

وہ دائرے جو بنتے رہے ٹوٹتے رہے
دستِ صبا سے جام سدا چھوٹتے رہے
دل تھا کہ ذامگاہِ تمنا بنا رہا
خاموش آرزو کا تقاضا بنا رہا

قایم جو کی ہیں حسن نے ریشم کی سرحدیں
پھولوں کے وہ حصار، وہ شبنم کی سرحدیں
اُن کے خیال سے کبھی باہر نہ آ سکے
"لمسِ شجر کی بات کو جذبے نہ پا سکے

رامش گر نسیم و صبا کہہ سکیں جسے
جشنِ بہار ناز و ادا کہہ سکیں جسے
وہ زلفِ پُر شکن ہے کہ بندِ قبائے گل
"ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل"

پھر بھی جو دل سے لپٹی ہے زنجیر ہے کوئی
پردے میں احتیاط کی تصویر ہے کوئی
لگتا ہے دل سے لاکھ بہانے گزر گئے
خوشبو کی جستجو میں زمانے گزر گئے

دل کی لگاوٹوں کے جنھیں سلسلے کہیں
تپتی دپہاوٹوں کے جنھیں سلسلے کہیں
جذبے وہ دھوپ چھاؤں بنے اور گزر گئے
پہنائیوں میں وقت کی آخر بکھر گئے

ہنگامہ ہائے شوق بھی ہیں زندگی کے ساتھ
پرچھائیوں کا رقص ہے تابندگی کے ساتھ
جو وجہ اضطراب ہے وجہ سکوں بھی ہے
فکر و نظر کے ساتھ ہی ذوقِ جنوں بھی ہے

وہ چشمِ نیم ناز غزل کہہ سکیں جسے
وہ ارتعاشِ ناز غزل کہہ سکیں جسے
ممنوع ہے جو لمس، نشانِ شعور ہے
نزدیک تر ہے دل سے جو آنکھوں سے دور ہے

۱۲/۹/۹۱
دہلی

بعنوانِ سلام

یہ لطف وکیف کے جھرمٹ، یہ منظرِ شاداب
یہ رنگ ونور کی دنیا، جہانِ حسن وشباب
ادب سے جھک کے، یہ کہتی ہے کہکشاں آداب
ادا و ناز سے کچھ مسکرا کے زیرِ حجاب
یہ شوخ و شنگ ستارے سلام کہتے ہیں

یہ مے فروش ہوائیں، یہ لحنِ شیریں
یہ مست مست فضائیں، یہ منظرِ رنگیں
ادائے شب ہے کہ دریا کی چادرِ سیمیں
حسین خواب کی صورت، یہ کائناتِ حسیں
یہ چاندنی یہ نظارے سلام کہتے ہیں

یہ کنج کنج میں پھولوں کی جاں فزا خوشبو
فضائیں بکھرے ہوئے، شب کے ریشمی گیسو
یہ عطر و نور، یہ شبنم کی بارشیں ہر سو
یہ نو شگفتہ شگوفوں میں بولتا جادو
یہ شاخِ گل کے اشارے سلام کہتے ہیں

یہ پر سکون مناظر، یہ ساحلِ دریا
یہ نغمہ بار ہوائیں، یہ گل فروش فضا
سبو بدوش یہ موجیں یہ حسن و ناز و ادا
یہ رنگ و بو یہ حسیں رُت یہ منظرِ زیبا
یہ پُر بہار کنارے سلام کہتے ہیں

یہ رنگ و بو کا زمانہ یہ موسمِ برسات
یہ اُجلے اُجلے ستارے یہ کالی کالی رات
لبوں پہ سرد ہواؤں کے رس بھرے نغمات
ترے بغیر مگر بے صدا ہے سازِ حیات
تجھے یہ رین نظارے سلام کہتے ہیں

یکم ستمبر ۱۹۴۲ء
کیرانہ

راج گھاٹ

کتنے سجدے وہ جبینوں میں لئے آتے ہیں
کتنی شردھائیں وہ سینوں میں لئے آتے ہیں
کتنی اس خاک کے ذرّوں سے عقیدت ہے انہیں
کتنی اس پاک سمادھی سے محبّت ہے انہیں
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کے لیے

جو زمانے میں ہیں تہذیب و تمدّن کے امام
جن کے ہاتھوں میں ہے تدبیر و سیاست کی زمام
صدق و اخلاص و اخوّت کے پیامی بن کر
سر جھکائے ہوئے قوموں کے سلامی بن کر
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کے لیے

کس قدر ہے انہیں ستیہ سے اہنسا سے پریم
کس قدر ہے انہیں روندی ہوئی دنیا سے پریم
کتنا اونچا ہے وہ آدرش جو لاتا ہے انہیں
درسِ قربانی و خدمت کا سکھاتا ہے انہیں
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کیلیے

کس قدر سچ کی خدائی سے محبّت ہے انہیں
ابنِ آدم کی بھلائی سے محبّت ہے انہیں
کس قدر اس روشِ خام پہ مغموم ہیں وہ
کتنے انسان کے انجام پہ مغموم ہیں وہ
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کے لیے

کتنے قومی عصبیت سے وہ بالاتر ہیں
کتنے حدِ وطنیت سے وہ اعلاتر ہیں
رنگ اور نسل کی تعظیم سے نفرت ہے انہیں
کتنی انسان کی تقسیم سے نفرت ہے انہیں
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کیلیے

کتنا اخلاق کی قوت پہ یقیں ہے ان کو
کتنا ادیان کی وحدت پہ یقیں ہے ان کو
کتنے عامل ہیں اخوت پہ مساوات پہ وہ
کتنے مرمٹنے کو تیار ہیں حق بات پہ وہ
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کیلیے

کتنی ہمدردی ہے گاندھی کے مشن سے ان کو
کتنی الفت ہے اہنسا کے چلن سے ان کو
کتنے گاندھی تھے جو مارے گئے ان کے ہاتھوں
موت کے گھاٹ اتارے گئے ان کے ہاتھوں
وہ جو آتے ہیں یہاں پھول چڑھانے کیلیے

۲۴ اگست ۱۹۷۹ء
آسارا